کردار کی کرنیں
پروفیسر سعید راشد

تعارف

مصنف	سعید راشد
تاریخ پیدائش	20 جنوری 1927ء
رسمی تعلیم	ادبیات اردو انگریزی اور فن تعلیم
مربی درسگاہیں	اسلامیہ کالج بریلی
	بریلی کالج بریلی،
	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مربی اساتذہ	مولوی محمد محسن،
	جناب مبارک حسین
	ڈاکٹر شوکت سبزواری،
	ڈاکٹر داس گپتا،
	ڈاکٹر عشرت حسین،
	پروفیسر رشید احمد صدیقی
	ڈاکٹر ذاکر حسین خان
رول ماڈل	سرسید احمد خان،
	قائداعظم
ذہنی پس منظر	تحریک پاکستان کا دور
مشن	کردار سازی، پاکستانیت کا فروغ
تاریخ وفات	۱۹ جون، ۱۹۹۹ء
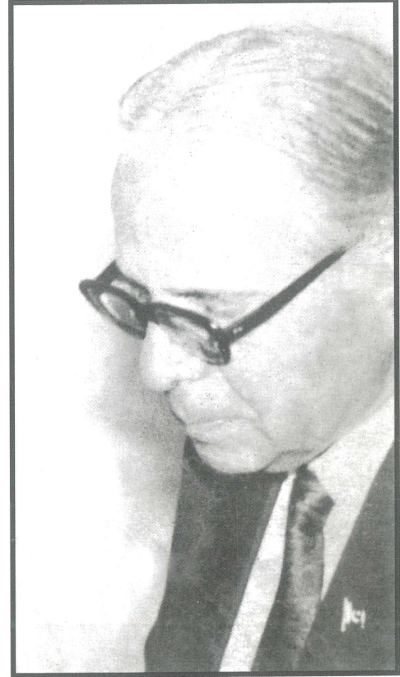
کردار کی کرنیں

سعید راشد

سعید راشد ٹرسٹ

ناشر	سعید راشد ٹرسٹ
مطبع	اے آر پرنٹرز، اسلام آباد فون: ۴۱۰۰۵۸۶، ۴۴۳۱۷۹۷
سن طباعت	اگست ۲۰۰۵ء
ایڈیشن	ساتواں
تعداد	ایک ہزار
قیمت	۱۵۰ روپے

سعید راشد ٹرسٹ

۳۴۹۔ سٹریٹ ۱۵، چکلالہ ۳، راولپنڈی

فون: ۵۵۹۰۸۵۷، موبائل: ۹۵۵۲۲۴۳۔ ۰۳۰۰

ای میل: asifsr@brain.net.pk

انتساب

کردار کے دھنی ان عظیم انسانوں کے نام
جو چراغ جلائے بیٹھے ہیں آندھیوں میں
اور مایوس نہیں ہیں۔

نمبر شمار

۱۔
۲۔
۳۔
۴۔
۵۔
۶۔
۷۔
۸۔
۹۔
۱۰۔
۱۱۔
۱۲۔
۱۳۔
۱۴۔
۱۵۔
۱۶۔
۱۷۔
۱۸۔
۱۹۔
۲۰۔
۲۱۔
۲۲۔
۲۳۔

ترتیب

باب دوم

حکایات

باب سوم
متفرقات

حرف چند

جون ۱۹۹۹ء میں ابا جان کی وفات کے بعد یہ سوال کہ ان کے کام یا یوں کہیئے کہ ان کے مشن کو آگے کیسے بڑھایا جائے اور دیے جلانے کا جو عمل انہوں نے ساری زندگی کیا اسے کیسے جاری رکھا جائے ہمارے لیے بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ ایک ادیب اپنی تحریروں میں زندہ رہتا ہے اور یہی اس کا سرمایہ ہوتی ہیں سوچ " کردار کی کرنیں ،، کے اس ساتویں ایڈیشن کی طباعت کا محرک ہے۔ کردار کی ان کرنوں کا دائرہ اثر بہت وسیع ہے اور ہماری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد تک یہ پیغام پہنچ سکے۔

اس کتاب کی اشاعت کیلیئے میں اے آر پرنٹرز کے اقبال صاحب کا مشکور ہوں اور خاص طور پر محترمی مجی کرنل و بیگم یونس کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنکی عملی شرکت کے بغیر یہ کتاب آپکے ہاتھوں میں نہیں آسکتی تھی۔

اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے گا۔

آصف سعید راشد

راولپنڈی

اگست ۲۰۰۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

کردار کی کرنیں ایسے مختصر مگر پراثر واقعات کا تذکرہ ہے جو انبیاء کرام کے مشن اور مقصد کی یاد دلاتا ہے۔ قرآن پاک نے انسانی کردار کی تعمیر میں جن عناصر کو بنیادی قرار دیا ہے ان میں ہدایت، ہادی اور مہتدی تینوں کا ایک قریبی ربط و تعلق نظر آتا ہے۔ ہدایت صرف خالق کائنات اور رب ہی کی طرف سے ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اپنی مخلوق کے مفاد اور مقصد تخلیق سے وہی سب سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ وہی یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ کون فرد اس ہدایت کو اس کی منشاء اور مرضی کے مطابق انسانوں تک پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے انبیاء کرام عام مصلحین کی طرح اپنے طور پر یہ طے نہیں کرتے کہ انہیں کہاں، کیسی اور کس طرح اصلاح کرنی ہے۔ یہ فیصلہ اللہ سبحانہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ اپنے بندوں میں سے کس کو اس منصب سے نوازیں۔ اور ایک فرد باوجود دن رات کوشش اور دعا کرنے کے اس منصب پر فائز نہیں ہوسکتا جب تک خود اللہ سبحانہ تعالیٰ نے یہ طے نہ کرلیا ہو کہ اس کو یہ ذمہ داری سونپنی ہے۔

ہادی جن افراد سے مخاطب ہوتا ہے وہ اس کے جانے پہچانے اپنے ہی افراد ہوتے ہیں۔ وہ کہیں باہر سے درآمد نہیں کیا جاتا بلکہ وہ انہی افراد میں سے ایک فرد ہوتا ہے جس کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ اور اس کی مخالفت اور حمایت کرنے والے افراد اسے ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں اپنی ملکہ کو پہچانتی ہیں۔

ہدایت کی طرف پکارنا اور اصلاح کی دعوت دینا جس طرح انبیاء کرام کا مشن اور ذمہ داری ہے ویسے ہی اس کار عظیم کی ذمہ داری ان تمام افراد پر بھی ڈال دی گئی ہے جو اپنے قلم، زبان اور سب سے بڑھ کر اپنے طرز عمل سے دوسروں تک دین کا پیغام پہنچا سکتے ہوں۔

آپ بیتی، حکایات، قصص اور واقعات کے ذریعہ اصلاحی ادب کی تخلیق ایک لحاظ سے قرآنی طرز دعوت و اصلاح کا ہی ایک انداز ہے۔ قرآن پاک نے ایک قصے کو خود احسن القصص کہا ہے اور ان واقعات کو بطور مثال پیش کر کے انسان کو عبرت، غور و فکر، تحلیل و تجزیہ، تدبر و تفہیم اور تعقل پر ابھارا ہے۔ اصلاحی ادب کا یہ انداز قران پاک کے زیر سایہ اپنی اثر انگیزی میں ادب کی دیگر

اصناف سے کسی لحاظ سے کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ یہ واقعاتی انداز خالص ظن وگمان کے مقابلہ میں فطرت انسانی اور روح اصلاح ودعوت سے زیادہ قریب ہے۔

اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو یہ کتاب ''کردار کی کرنیں'' اس وقت کی ایک ضرورت ہے۔ کرنوں کے ذریعے جو نور عوام الناس اور طالبان حق تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے وہ ایک مثبت اور تعمیری اقدام ہے۔ ان واقعات میں جن افراد کا ذکر آیا ہے ان میں بہت معروف ومشہور شخصیات بھی شامل ہیں لیکن یہاں ان کا تعارف جس حیثیت سے ہو رہا ہے وہ ان کا خود اعلیٰ اسلامی اقدار حیات پر عمل یا دوسروں کے عمل سے متاثر ہو کر اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔

اس مجموعہ کی افادیت یوں تو سب کیلئے ہے لیکن بالخصوص نوجوان نسل تک اسے ضرور پہنچنا چاہیے تاکہ وہ کردار کی کرنوں سے اپنی شخصیت کی تعمیر میں رہنمائی حاصل کرسکیں۔ میں اس کے مؤلف پروفیسر سعید راشد کو تہہ دل سے اس اعلیٰ اسلامی ادبی خدمت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد
ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی
اسلام آباد

بے جی آپ نے بڑا احسان کیا

جب علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی کا انتقال ہوا اور علامہ کے دوست احباب تعزیت کے لئے گئے تو علامہ بار بار کہتے:

"بے جی آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔"

حاضرین حیران تھے کہ علامہ کسی خاص احسان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ آخر حاضرین میں سے کسی نے پوچھا: حضرت، ہر ماں سراپا احسان ہوتی ہے۔ آپ کا اشارہ کسی خاص احسان کی طرف ہے؟

علامہ: ہاں، ایک خاص احسان کی طرف۔

حاضرین: اگر بار خاطر نہ ہو تو ارشاد فرمائیں۔

علامہ: میں نے سنا ہے کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو والد ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے یہاں کپڑے سینے پر ملازم تھے۔ چونکہ ڈپٹی صاحب انگریز سرکار کے ملازم رہ چکے تھے۔ اور اس کی پنشن کھاتے تھے۔ اس وجہ سے بے جی کو شبہ ہو گیا تھا کہ ان کی آمدنی کا ایک حصہ شرعاً مشکوک ہے۔ اس لئے انہوں نے مجھے اپنا دودھ پلانا بند کر دیا۔ پھر اپنی محنت سے خریدی ہوئی بکری کا دودھ پلانے لگیں۔ بعد میں والد صاحب نے صورتحال کی وضاحت کی اور ڈپٹی صاحب کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ لیکن اس واقعہ سے مجھ پر رزق حلال کی اہمیت واضح ہوگئی کہ رزق حلال ایمان کی جان ہے۔

☆☆☆☆☆☆

توبہ کی قیمت

ایک صاحب ریلوے میں ملازم تھے۔ ٹکٹ چیکری کرتے تھے۔ جب ملازمت کی عمر کے اختتام پر پہنچے تو حسب دستور ملازمت سے، ضابطہ کے مطابق پنشن کے ساتھ فارغ کر دیئے گئے۔ ملازمت کے دوران اچھا خاصا اندوختہ جمع کر لیا تھا۔ پیسے کی طرف سے کچھ ایسا تردد نہ تھا۔ لیکن دل

بے چین تھا۔ ایمان کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ بھلائی اور بہتری کی تلاش رہتی ہے اور گناہوں اور کوتاہیوں پر دل بے چین ہو جاتا ہے۔

یہ صاحب لاہور کے درویش صفت عالم، مفتی محمد حسن کی خدمت میں پہنچے۔

سائل: حضرت بیعت کر لیجیے۔ روشنی کے راستے کی تلاش ہے۔

مفتی صاحب: اب تک کیا کرتے رہے ہو؟

سائل: ریلوے میں ٹکٹ چیکر تھا۔

مفتی صاحب: کتنا عرصہ ملازمت کی؟

سائل: تیس برس۔

مفتی صاحب: تیس برس کی تمام ناجائز یافت کا حساب کرو، جو حقدار مل سکے اسے لوٹا دو اور جس کا حقدار نہ ملے وہ محکمہ ریل کے کھاتے میں جمع کرا دو۔ جب یہ کر چکو تو بیعت کے لئے آ جانا۔

ان صاحب نے جب گھر جا کر برسوں کی ناجائز یافت کا حساب لگایا تو بات ہزاروں تک پہنچی۔ لیکن اپنے ارادے میں مخلص تھے۔ جو کچھ اندوختہ تھا جو جائیداد بنائی تھی اسے چپکے سے فروخت کر دیا۔ جس طرح مرشد نے بتایا تھا اسی طرح کیا۔ جو حقدار مل گیا اسے اس کا حق ادا کر دیا۔ باقی ریلوے کے کھاتے میں جمع کروا دیا۔ تیس سال کی کمائی سے دامن جھاڑ کر اٹھے اور مفتی صاحب کا دامن پکڑ لیا اور کندن بن گئے۔

روپے کی محبت سب سے بُری ہوتی ہے۔ لوگ اور بہت کچھ چھوڑ دیتے ہیں لیکن پیسے کو چھوڑتے وقت ہزار بار سوچتے ہیں اور ہزار بہانے بنا کر اور ہزار توجیہیں کر کے دولت کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن جس کا قلب روشن ہو جائے وہ مال و دولتِ دنیا اور رشتہ و پیوند، دونوں کو وہم وگمان کا بت سمجھتا ہے۔

بیٹا ہماری عاقبت خراب نہ کرو

مشہور شاعر احسان دانش کی خودنوشت سوانح حیات ''جہان دانش'' بھی خوب کتاب ہے۔ یہ قطرہ سے گہر ہونے تک کی داستان ہے۔ آدمی اپنے عزم، ہمت، حوصلے اور سب سے بڑھ کر اپنی دیانت کے سہارے کیسے آگے بڑھتا ہے۔ مصائب اور مشکلات کے کیسے کیسے پہاڑ سر کرتا ہے۔ یہ سفر کی ولولہ انگیز کہانی ہے۔ زندگی کی سنگین حقیقتیں اس کتاب میں جتنی ملتی ہیں، اتنی شاید کسی اور سوانح حیات میں نہ ملیں۔ جہاں کہیں بھی کوئی درماندہ ہے، شکستہ دل ہے، مایوس ہے، تھکا ہارا ہے، زمانے کا ستایا ہوا ہے، وہ اسے ضرور پڑھے۔ یہ کتاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ لیکن خود احسان دانش کو یہ عزم، یہ حوصلہ، یہ بے لاگ دیانت، یہ بے داغ شرافت کہاں سے ملی؟ یہ چراغ کس چراغ سے روشن ہوا؟ اس کا جواب اسی کتاب میں موجود ہے۔

جناب احسان کاندھلہ کے کانجی ہاؤس میں چوکیداری کی خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ وہاں تنخواہ کے علاوہ تھوڑی بہت بالائی آمدنی بھی تھی۔ بہت معمولی سی لیکن تھی ضرور۔ جب ان کی والدہ کو اس صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے انہیں بلا بھیجا۔ مغرب کی نماز کے بعد دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

احسان دانش: السلام علیکم!

ماں: جیتے رہو، بیٹا۔

احسان دانش: آپ نے مجھے بلایا تھا۔

ماں: ہاں!

احسان دانش: کوئی خاص بات ہے؟ آج آپ اتنی چپ چپ اور افسردہ کیوں ہیں؟

ماں: (ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے رندھی ہوئی آواز میں) احسان، تم جانتے ہو کہ ہم ایک وقت کا کھا کر بھی گزارا کر لیتے ہیں۔ اور فاقوں میں بھی شکرانے سے غافل نہیں ہوئے۔ بیٹا، تم ہمیں بڑھاپے میں حرام روزی کھلا کر ہماری عاقبت کیوں خراب کرتے ہو؟ ہم نے تمہارا بچپن اپنے پاک خون سے سینچا

ہے اور تمہاری پرورش اکل حلال سے کی ہے۔ اس سلوک کا بدلہ یہ تو نہیں کہ تم ہماری عاقبت ہی خراب کر دو۔

احسان دانش: (روکر) میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ اور قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی اس قسم کے پیسے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔

احسان دانش یہ مکالمہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''والدہ نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میرے سامنے چنگیر لا کر رکھ دی۔ اس میں جو روٹیاں تھیں وہ ماش کی دال کے چھلکوں کو پیس کر آٹا اور نمک مرچ ملا کر پکائی ہوئی تھیں، میں نے شوق سے کھانا شروع کر دیا تو والدہ نے کہا:

''بیٹا، دیکھو کیسی مزیدار روٹیاں ہیں۔ ہم زبان کے ذائقہ کیلئے ایمان کیوں خراب کریں۔ حرام حلال کی تمیز اسلامی معاشرہ کی جان ہے۔ جب تک یہ سلامت ہے سب کچھ سلامت ہے۔''

☆☆☆☆☆

توبہ توبہ میں اور اس لکڑی پہ پکی روٹی اپنے بچوں کو کھلاؤں؟

قصبہ دولت نگر، ضلع گجرات کے بڑھے خان مرحوم کی بی بی بالکل ان پڑھ تھیں لیکن دین کی سوجھ بوجھ رکھتی تھیں۔ اپنے شوق سے قرآن حکیم کی ایک دو نہیں پانچ دس لمبی سورتیں زبانی یاد کر لی تھیں۔ اور جب تہجد کے بعد چکی پیسنے بیٹھتیں تو بلند آواز سے کبھی سورہ مزمل، کبھی سورہ ملک، کبھی سورہ یٰسین یا سورہ رحمٰن پڑھتی جاتیں۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ بچے اٹھتے تو پہلی آواز جو ان کے کانوں میں پڑتی وہ یہی ہوتی۔ فبای الاء ربکما تکذبن ○ فبای الاء ربکما تکذبن ○ انہی متقی خاتون کا قصہ ہے کہ ایک شام چولہا جلانے لگیں تو پتہ چلا کہ ایندھن کی لکڑی ختم ہو چکی ہے اور جو ہے وہ گیلی ہے۔ بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ ادھر کھانا پکانے کی جلدی اور ادھر چولہا جلانے کا مسئلہ۔ ناچار ہو کر میاں کو آواز دی کہ جائیں اور ذرا جلدی سے تھوڑی سے جلانے کی لکڑی لے آئیں۔ وہ گئے اور تھوڑی دیر بعد سوکھی لکڑیوں کا ایک گٹھالا کے آنگن میں ڈال دیا۔

بڈھے خان مرزا: لو بھئی، تمہارا کام تو بن گیا۔ مزے سے جلاؤ۔ بالکل سوکھا بالن ہے وہ بھی مفت کا۔

بی بی: مفت کا کیسے؟

بڈھے خان: مفت کا ایسے کہ میں کریمے کے ٹال کی طرف لکڑیاں خریدنے جا رہا تھا کہ راستے میں کھیتوں کی باڑھ کی یہ لکڑیاں اکھڑی ہوئی بلکہ پڑی ہوئی ملیں۔ میں اٹھا کر لے آیا۔ سوکھے کیکر کی ہیں خوب جلیں گی۔

بی بی: یہ تو چوری ہوئی۔ میں اور اپنے بچوں کو اس لکڑی پر پکی ہوئی روٹی کھلاؤں؟ روٹی حرام نہ ہو جائے گی؟ بہتر ہے آپ ابھی جائیں اور اس لکڑی کو وہیں ڈال کے آئیں، جہاں سے اٹھا کر لائے تھے۔

یہ واقعہ ان خاتون کے بیٹے، حکیم مرزا غلام محی الدین نے بیان کیا۔

☆☆☆☆☆

ایک غیرت مند غریب

بعض لوگوں کی غریبی دیکھ کر دل گھٹنے لگتا ہے۔ یا اللہ تیری خدائی میں ایسے لوگ بھی ہیں لیکن جب ان ہی کی غیرت کو دیکھا جائے تو اس سے زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ ایسی غربت اور ایسی غیرت۔

لاہور کے ایک حکیم صاحب کے مطب میں ایک خستہ حال مزدور آیا اور رونے لگا، حکیم صاحب نے پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگا، بچی بیمار ہے آپ چل کر دیکھیں تو شاید اس کے بچنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ حکیم صاحب مطب کے اوقات میں عموماً مریضوں کو دیکھنے نہیں جاتے تھے۔ لیکن اس غریب مزدور کی درخواست میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ اٹھے اور اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ مزدور کا کوارٹر زیادہ دور نہ تھا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ ایک جوان لڑکی کا ڈھانچہ بستر پر پڑا ہے۔

حکیم صاحب: یہ کب سے بیمار ہے؟

مزدور: تین چار ماہ تو ہو گئے۔

حکیم صاحب: کچھ علاج کروایا؟

مزدور: فیکٹری کی ڈسپنسری سے دوا لیتی رہی ہے۔

حکیم صاحب: بخار کب سے ہے کچھ کھاتی پیتی ہے؟

مزدور: کھانا کہاں کا؟ پانی بھی نہیں پچتا۔

حکیم صاحب: (نبض دیکھتے ہوئے) یہ پیروں پر اخبار کیوں ڈال رکھی ہیں ان کو ہٹاؤ۔

مزدور: حکیم جی، بے پردگی کے خیال سے اخبار ڈال دیئے ہیں۔

حکیم صاحب یہ سن کر سناٹے میں آ گئے بمشکل آنسو روک سکے۔ بچی کو دیکھا حال احوال پوچھا اور الٹے پاؤں واپس آئے۔ نسخہ لکھ کر دواخانے میں دے دیا۔ اور زنانہ میں جا کر اپنی بیگم کے دو نئے جوڑے ایک چادر اور بیس روپے لا کر مزدور کو دیئے۔

حکیم صاحب: آپ کی بچی میری بچی ہے۔ آپ اسے یہ کپڑے پہنائیں، چادر اوپر سے ڈالیں اور ان پیسوں سے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کریں۔ بچی کو پھلوں کا رس دیں۔ دوائیں ابھی تیار ہو کے آ رہی ہیں۔

مزدور: حکیم جی، میں نے فیس بھی نہیں دی۔

حکیم صاحب: مشورے کی فیس میں کسی سے نہیں لیتا۔ میرے مرشد نے مجھے منع کر رکھا ہے۔ میرا رزق فراخ ہے۔

مزدور: لیکن یہ کپڑے اور یہ پیسے میں ہرگز نہ لوں گا۔

حکیم صاحب: یہ خیرات نہیں ہے۔ یہ ہدیہ ہے، ایک بھائی کی طرف سے۔

مزدور: میں اسے قرض سمجھ کے تو لے سکتا ہوں کسی اور طرح نہیں۔ وہ بھی اس لئے کہ بچی کی جان بچا سکوں۔ میری غریبی تو قسمت سے ہے۔ لیکن غیرت اور خودداری انسان کے اپنے حوصلے سے ہے۔

☆☆☆☆☆

پچاس سال تک فاتحہ

انسان جو کچھ سیکھتا ہے ماں باپ سے سیکھتا ہے یا استادوں سے۔ علامہ اقبال اس لحاظ سے بہت خوش قمت تھے کہ ان کے والدین بھی سچے اور پکے مسلمان تھے۔ تقوے کی تصویر اور ان کے اساتذہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ خصوصاً ان کے استاد مولوی میر حسن جو حد درجہ متقی اور بااصول انسان تھے اور عزم وثبات کا پیکر۔ مولوی میر حسن کی ایک بہن تھیں۔ 1857ء میں وہ بیمار ہوئیں اور ایسی بیمار ہوئیں کہ علاج معالجہ کچھ کارگر نہ ہوا۔ اور ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

مولوی میر حسن ان کی پٹی سے لگے دن رات تیمارداری میں مصروف رہتے۔ لیکن افاقہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ایک روز عصر کے بعد مولوی صاحب اور ان کی بہن کے مابین یہ گفتگو ہوئی:

مولوی میر حسن: جو حال ہو بتاؤ، کیا بہت اداس ہو؟ کچھ چپ چپ ہو۔

بہن: میں گھر میں ہوں زندہ ہوں، اور آپ سب مجھ سے پوچھتے ہیں۔

مولوی میر حسن: کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو؟

بہن: کل مر جاؤں گی اور قبر میں اکیلی ہوں گی تو کوئی دعا کیلئے بھی وہاں نہ آئے گا۔

مولوی میر حسن: بہن، تم اپنا دل میلا نہ کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں جب مجھ میں چلنے پھرنے کی سکت رہے روزانہ تمھاری قبر پر فاتحہ پڑھنے آؤں گا۔

مولوی میر حسن کے بھتیجے سید ذکی شاہ لکھتے ہیں کہ مولوی میر حسن نے اس عہد کو عمر بھر اس طرح نبھایا کہ کوئی کیا نبھائے گا۔ جب تک ان کی بینائی زائل نہ ہوگئی وہ پچاس سال سے زیادہ عرصے تک ہر روز اپنی مرحومہ بہن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے رہے۔ سردی ہو یا گرمی یا بارش ہو یا آندھی چلے، وہ اگر سیالکوٹ میں ہوتے تو صبح کی نماز پڑھتے ہی قبرستان کی طرف روانہ ہو جاتے اور تلاوت کرتے جاتے۔ ہمشیرہ اور والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے اور پھر اسی طرح تلاوت کرتے واپس آ جاتے۔ چونکہ یہ روز کا معمول تھا اس لئے جن لوگوں کو ان سے ملنا جلنا ہوتا وہ اکثر انہی اوقات میں قبرستان چلے جاتے یا آتے جاتے راستے میں مل لیتے۔ جو کچھ مولوی میر حسن پچاس

سال تو اتر سے کرتے رہے وہ محض ایک بہن سے وعدے کا پاس ہی نہیں تھا بلکہ ایک طرز زندگی تھا۔ جس شخص نے پچاس برس تک یہ عہد نبھایا وہ اپنی زندگی کے دوسرے معاملات میں کتنا بااصول، کتنا پرہیزگار اور کتنا متقی ہوگا۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولوی میر حسن کے بعض شاگردان کا کتنا ادب کرتے تھے اس کا حال ذکی شاہ کی زبانی سنئے۔

''ہمارے کپڑے ایک غیر مسلم دھوبن دھوتی تھی۔ اس کا لڑکا بھی ساتھ آیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے شوق سے پڑھانا شروع کیا۔ جب بڑا ہوا تو اپنی خوشی سے مسلمان ہوگیا۔ اس کا اسلامی نام رکن الدین رکھا گیا۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے خرچ سے پوری تعلیم دلوائی۔ اس کے ساتھ مولوی صاحب کا ایک شاگرد نہال سنگھ تھا۔ رکن الدین اور نہال سنگھ دونوں میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے اور مقابلے کے امتحانوں میں برابر اول دوم نکلتے رہے۔ رکن الدین سیشن جج کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائرڈ ہوئے نہال سنگھ پہلے ڈپٹی کمشنر بنے۔ پھر پٹیالہ میں انہیں وزارت کا عہدہ ملا۔

ان دونوں شاگردوں کا یہ حال تھا کہ رکن الدین مولوی صاحب سے ملنے آتے تو واپس ہوتے وقت پچھلے پاؤں چلتے کبھی مولوی صاحب کی طرف پیٹھ کر کے نہیں چلے۔ نہال سنگھ کی یہ کیفیت تھی کہ گاڑی پر سوار جا رہے ہوتے، جہاں مولوی صاحب پر نظر پڑتی گاڑی رکوا کر اتر جاتے اور ادب سے ان کے قدم بقدم چلتے، ان کی موجودگی میں کبھی گاڑی پر سوار نہ ہوتے۔''

☆☆☆☆☆

بوریئے میں زیادہ آرام

پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کیلئے علامہ اقبال سمیت پنجاب کے چوٹی کے وکیلوں کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی پر ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو علامہ جب اپنے کمرے میں گئے تو اسے عشرت کدہ پایا آسائش و آرام کی قیمتی سے قیمتی چیز موجود تھی۔ ان کیلئے جو بستر لگایا گیا تھا وہ تو خاص طور پر نرم و نفیس تھا۔ اس پر لیٹتے ہی یکا یک اٹھ بیٹھے اور غسل خانے میں چلے گئے۔

علامہ: علی بخش...... علی بخش......

علی بخش: کدھر، ڈاکٹر صاحب؟

علامہ: غسل خانے کی طرف آؤ۔

علی بخش: غسل خانہ میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کا کمرہ اور بستر تو بادشاہوں جیسا ہے۔

علامہ: علی بخش، ہاں مجھے بھی معلوم ہے۔ لیکن بستر پر لیٹتے ہی مجھے خیال آیا کہ جن رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں، انہوں نے تو بوریئے پر سو سو کر زندگی گزار دی تھی۔ اس خیال سے دل بھر آیا۔ اب اس نرم و نفیس بستر پر لیٹنا میرے لئے ممکن نہیں۔ جاؤ باہر سے کوئی معمولی سی چارپائی اٹھا لاؤ اور اس پر میرا اپنا بستر بچھا دو۔

علی بخش: جو حکم۔ لیکن آپ ذرا اس کے مزے بھی اٹھاتے۔

علامہ: مجھے اپنے بوریئے میں زیادہ آرام ملے گا۔

☆☆☆☆☆

وہ اجرت حرام ہے جو کام کو بڑھا کر لی جائے

مسٹر داس پٹنہ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ ان کے پاس ریاست آرہ کا ایک مقدمہ آیا۔ اس سلسلہ میں فارسی کی قدیم دستاویزات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ان پر تبصرہ کرنا تھا۔ بیرسٹر داس نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی خدمات حاصل کیں۔ علامہ پٹنہ گئے اور مقدمہ کے کاغذات تحویل میں لے لئے۔ دوسرے دن بیرسٹر داس اور علامہ میں یہ گفتگو ہوئی:

داس: ڈاکٹر صاحب دستاویزات آپ نے دیکھیں؟

علامہ: جی ہاں۔ یہ لیجئے، میں نے خلاصہ تیار کر لیا ہے۔ دعوے کے دلائل ترتیب دے دیئے ہیں۔

داس: ارے، اتنی جلدی؟

علامہ: مثل تو بہت ضخیم ہے۔ لیکن اصل متعلقہ کاغذات زیادہ نہیں تھے۔

داس: پھر بھی کچھ وقت تو لینا تھا۔ آپ کو ایک ہزار روپے روز کی فیس پر یہاں بلایا گیا ہے، دو چار ہزار تو بنتے۔

علامہ: مسٹر داس، میرے مالی فائدے میں جو آپ کی دلچسپی ہے اس کیلئے آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس روزی کو حرام قرار دیا ہے جو کام کو بڑھا کر لی جائے۔

☆☆☆☆☆

اس معاہدے سے ارتکاز میں کمی آئے گی

علامہ اقبال پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن اس سلسلے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ذرا شبہ بھی ہو جاتا کہ مقدمہ جھوٹا ہے تو اس کو ہاتھ نہ لگاتے خواہ موکل کتنی زیادہ فیس دینے پر آمادہ ہوتا۔ صحیح مقدمے بھی صرف گزارے بھر کے لیتے تھے۔ جوں ہی چھ سات سو روپے ہاتھ آ جاتے مزید کیس لینا بند کر دیتے۔ 1935ء سے جب گلے کی تکلیف بڑھی تو آمدن کا یہ رہا سہا سہارا بھی نہ رہا۔ کچھ کتابوں کی رائلٹی ملتی تھی اور تھوڑا بہت پیسہ بینک میں جمع تھا، بس اسی طرح تنگی ترشی سے کام چل رہا تھا۔ دوستوں اور نیاز مندوں کو صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے اس سلسلے میں سلسلہ جنبانی شروع کیا۔

حیدر آباد کے وزیراعظم سر اکبر حیدری نے علامہ کے ایک خاص دوست اور نیاز مند میاں امیر الدین کو لکھا کہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کی خدمت میں ان کی یہ پیش کش پیش کریں:

میاں امیر الدین: ڈاکٹر صاحب۔ اب گلے کی تکلیف کا کیا حال ہے؟

علامہ: علاج جاری ہے۔ اللہ کرم کرے گا۔

میاں امیرالدین: سر اکبر حیدری نے مجھے لکھا ہے کہ میں ان کی ایک تجویز آپ کے سامنے رکھوں۔

علامہ: وہ کیا کہتے ہیں؟

میاں امیرالدین: تجویز یہ ہے کہ اگر آپ سال میں صرف ایک ہفتہ عثمانیہ یونیورسٹی جا کر لیکچر دے دیا کریں تو یونیورسٹی اس کا معاوضہ دس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرے گی۔

علامہ: آپ کو معلوم ہے کہ منجملہ اور تکلیفوں سے میرا گلا ہی تو بیٹھا ہوا ہے۔ بولنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ لیکچر کس طرح دوں گا۔

میاں امیرالدین: اس کا علم انہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے کہا ہے کہ آپ صرف لیکچر لکھ دیا کریں وہ کسی اور سے پڑھوالیا کریں گے۔

علامہ: (کچھ سوچ کر) پھر بھی اس تجویز کو قبول کرنا میرے لئے مشکل ہے۔

میاں امیرالدین: کیوں؟ میرے خیال میں تو یہ بہت معقول تجویز ہے۔

علامہ: مجھے بھی اس کی معقولیت میں کلام نہیں۔ وجہ تردد کچھ اور ہے۔

میاں امیرالدین: کیا؟

علامہ: میں اسلامی فقہ پر کتاب لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کنٹریکٹ منظور کرلوں تو میں ذہنی طور پر مصروف ہو جاؤں گا۔ اور کتاب مکمل نہ کرسکوں گا۔ اس لئے یہ کنٹریکٹ مجھے منظور نہیں۔

یہ واقعہ میاں صاحب کے حوالے سے خوشنود علی خان نے 10 نومبر 1980ء کے اخبار جہاں سے نقل کیا۔

☆☆☆☆☆

کچے اور پکے مکان

ایک دینی مدرسے کے ایک بزرگ استاد سید اصغر حسین ابوداؤد پڑھاتے تھے۔ اور خوب پڑھاتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے گھر پر بھی شاگردوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا، گھر کشادہ تھا۔ برسات آتی تو مولوی صاحب کو اس کی لپائی پتائی پر خاصا روپیہ اور وقت صرف کرنا پڑتا۔ ایک چہیتے شاگرد نے یہ دیکھا کہ مولوی صاحب کو ہر سال یہ زحمت اٹھانا پڑتی ہے تو کہا:

حضرت، میں کئی سال سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ کو ہر سال اس گھر کی مرمت پر خاصی توجہ کرنی پڑتی ہے۔

استاد: ہاں وہ تو ضروری ہے۔ پرانا گھر ہے۔ لپائی پتائی نہ ہوئی تو ڈھے پڑے گا۔

شاگرد: پچھلے دو تین سال میں آپ نے اس پرانے گھر کی لیپ پوت پر جتنا خرچ کیا ہے اتنے پیسے میں کم از کم یہ بیٹھک تو پختہ ہو سکتی تھی۔

استاد: میرے بھائی، سوال پیسے کا نہیں۔ اس سلسلے میں اللہ کا شکر ہے۔

شاگرد: تو حضرت پھر، کیا تکلف ہے؟

استاد: کوئی ایسا تکلف بھی نہیں۔

شاگرد: اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس امر کی وضاحت فرمائیں۔ ایک اچھے پختہ مکان سے آپ کے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

استاد: میرے بھائی۔ آپ خلوص سے ضد کرتے ہیں تو بتاتا ہوں۔ میرے پڑوس میں سب غریبوں کے کچے مکان ہیں اگر میں پکا مکان بنوا لوں تو ان غریب پڑوسیوں کے دل میں حسرت کا احساس پیدا ہوگا اور اتنی وسعت نہیں کہ سب کے مکان پکے بنواؤں۔

اللہ اکبر، یہ بزرگ کس مقام سے سوچ رہے تھے اور ان کا تقویٰ کس پائے کا تھا۔

☆☆☆☆☆

چھلکے پھینکنے کا فن

انہی مولوی سید اصغر حسین کے ہاں ایک بار یہی چہیتے شاگرد محمد شفیع ملاقات کیلئے گئے۔ علمی مذاکرے کے بعد مولوی صاحب نے ان کی تخمی آموں سے تواضع کی۔ جب آم کھانے سے فارغ ہوئے تو از راہِ شاگردی، محمد شفیع گٹھلیوں اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھا کر باہر پھینکنے چلے۔

مولوی صاحب: میاں، کہاں چلے؟

محمد شفیع: چھلکے وغیرہ باہر پھینکنے۔

مولوی صاحب: پھینکنے آتے بھی ہیں؟

محمد شفیع: چھلکے پھینکنے؟

مولوی صاحب: ہاں بھائی چھلکے پھینکنے کے بھی اپنے تقاضے ہیں۔ اس کو بھی ایک فن سمجھو۔

محمد شفیع: (حیرت سے) چھلکے پھینکنا اور فن؟

مولوی صاحب: ہاں بھائی، ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ تم اس فن سے واقف نہیں۔ لاؤ مجھے ٹوکری دو۔

یہ کہہ کر مولانا نے ٹوکری ان کے ہاتھ سے لے لی۔ پہلے چھلکے گٹھلیوں سے الگ کئے اس کے بعد باہر تشریف لائے اور سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے، معین جگہوں پر چھلکے رکھ دیئے اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں۔ یہ معمہ ان کے شاگرد کی سمجھ میں نہ آیا۔

محمد شفیع: حضرت، اس اہتمام میں کیا مصلحت ہے؟

مولوی صاحب: میرے بھائی دیکھتے ہیں کہ ہمارے مکان کے قرب و جوار میں زیادہ تر ایسے لوگ رہتے ہیں جنہیں جو کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔ اگر وہ آموں کے اتنے چھلکے یکجا دیکھیں گے تو انہیں اپنی غربت کا شدت سے احساس ہو گا۔ اور بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہو گی۔ اور اس ایذا دہی کا باعث میں بنوں گا۔ اس لئے میں چھلکے تھوڑے تھوڑے کر کے ذرا ذرا فاصلے پر ڈالتا ہوں۔ اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں سے جانوروں کے گلے گزرتے ہیں۔ یہ چھلکے ان کے کام آجاتے ہیں۔

محمد شفیع: تو گٹھلیوں کو الگ ڈالنے میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔

مولوی صاحب: ہاں وہ تو ہے۔

محمد شفیع: مثلاً کیا؟

مولوی صاحب: گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلتے کودتے رہتے ہیں۔ وہ ان گٹھلیوں کو بھون کر کھالیتے ہیں۔ اس طرح ان کا بھلا ہو جاتا ہے۔ یوں بھی گٹھلی ایک رزق ہے۔ اس کو ضائع کرنا مناسب نہیں۔

اس واقعہ پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ انہی مولوی سید اصغر حسین کا معمول تھا کہ جو کھانا گھر سے آتا تھا وہ خود بہت کم کھاتے۔ بیشتر محلے کے بچوں کو کھلا دیتے۔ جو روٹی بچ جاتی اسے بلی کیلئے دیوار پر رکھ دیتے۔ اور جو ٹکڑے بچ جاتے، ان کو چھوٹا چھوٹا کر کے چڑیوں کو ڈال دیتے اور دسترخوان کے ریزوں کو بھی ایسی جگہ جھاڑتے تھے جہاں چیونٹیوں کا بل ہو۔ تقویٰ کا یہ لطیف احساس......اور رزق کے احترام کا یہ عالم......سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

☆☆☆☆☆

کل میں رسول کریم ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

اپنی فارسی مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں علامہ اقبال نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ ایک ضدی فقیر دروازے پر بار بار صدا لگا رہا تھا۔ اور کسی صورت میں ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ان کو جو غصہ آیا تو اس کے سر پر ایک ڈنڈا دے مارا۔ فقیر لڑکھڑایا اور اس کی جھولی میں جو کچھ تھا وہ نیچے گر پڑا۔ علامہ کے والد شیخ نور محمد نے جب یہ دیکھا تو تڑپ اٹھے۔ سخت آزردہ ہوئے۔

شیخ نور محمد: یہ تم نے کیا کیا؟

اقبال: یہ یہاں سے ٹلتا کیوں نہیں تھا؟

شیخ نور محمد: بیٹا کل آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میدانِ حشر میں ہو گی اس میں ملت بیضا کے غازی، عالم، زاہد، عاشق، گنہگار سب ہی شامل ہوں گے تو اس مظلوم فقیر کے نالے بلند ہوں گے۔

بیٹا، جب تیرے لئے مرکب کے بغیر راستہ چلنا مشکل ہو گا اس وقت حضور ﷺ مجھے کہیں گے، اللہ نے ایک مسلمان نوجوان ترے سپرد کیا تھا تا کہ تو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے لیکن اس نوجوان نے میرے دین سے کوئی استفادہ نہ کیا۔ اور تو ایک

کام بھی نہ کر سکا۔ یعنی تو مٹی سے بنے ہوئے پتلے کو آدمیت کا سبق نہ دے سکا، تو میں اس کا کیا جواب دوں گا۔

بیٹا، ذرا خیال کر کہ امت خیر البشر کے اجتماع کے سامنے میری کیا حالت ہو گی۔ خدا کیلئے میری سفید ریش کالی نہ کر۔ میری امید و بیم کی کیفیت کا خیال کر اپنے باپ پر اتنے ستم نہ ڈھا اور آقائے کل کے سامنے اس بندہ عاجز کو رسوا نہ کر۔

☆☆☆☆☆

نوکروں کی دلداری

علامہ اقبال کے پرانے ملازم علی بخش کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو خود کھاتے تھے وہی نوکروں کو بھی کھلاتے تھے۔ نوکروں کیلئے کبھی الگ کھانا نہیں پکتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ نوکروں کیلئے گھر سے دال پک کر آئی جس میں گھی نہ ڈالا گیا تھا۔ جب علامہ کو پتہ چلا تو اندر گئے۔

علامہ: (سخت ناراضگی کے لہجہ میں) یہ چیز تم نے نوکروں کو نہیں کھلائی، مجھے کھلائی ہے۔ میں اس بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نوکر ہمارے دست و بازو ہیں۔ ہم ان کے پروں پر اڑتے ہیں۔ ہمارے کام ان کے سہارے چلتے ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے کہ کھانے میں ان کو الگ رکھا جائے۔

☆☆☆☆☆

بیوہ کے بچوں کی خاطر

خوش معاملگی اور انسانی ہمدردی علامہ اقبال پر ختم تھی۔ 1922ء میں علامہ انار کلی سے اٹھ کر میکلوڈ روڈ کی جس کوٹھی میں منتقل ہوئے وہ ان کے شایان شان نہ تھی۔ نہایت بدنما اور بوسیدہ اور کرایہ پونے دو سو روپے ماہانہ۔ دوست، احباب اور نیاز مند انہیں اکثر اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔

ایک روز علامہ سے عبدالمجید سالک کی یہ گفتگو ہوئی۔

سالک: ڈاکٹر صاحب یہ کوٹھی بدنما ہونے کے علاوہ بہت ہی خستہ حالت میں ہے۔

علامہ: جی ہاں۔ اس میں کھڑے رہنے کی کوئی بات نہیں۔ (ہنس کر) صرف میری دعاؤں سے قائم ہے۔

سالک: پھر پونے دوسو روپے کرایہ، حضرت یہ تو پیسہ برباد کرنے والی بات ہے۔ اس کرائے میں اس سے کہیں بہتر کوٹھی مل سکتی ہے۔

علامہ: آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دوسرے احباب کا بھی یہی خیال ہے لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہ کوٹھی ایک ہندو بیوہ کی ہے جس کے بچّوں کی گزران اسی کے کرائے پر ہے، مجھے یہ کوٹھی چھوڑنے یا کرایہ کم کرنے کی تحریک کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

انگریز کو رام کرنے کا نسخہ

1922ء میں جب علامہ اقبال انارکلی چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر کرائے کی ایک کوٹھی میں رہنے لگے تھے۔ اسی کوٹھی کے بارے میں ایک روز مرزا جال الدین بیرسٹر نے علامہ سے کہا۔

مرزا: میکلوڈ روڈ کی یہ کوٹھی بہرحال انارکلی کی رہائش سے زیادہ مکانیت رکھتی ہے۔ اس کی آرائش کی طرف بھی توجہ دیجیے۔ کم از کم اس کے مردانہ کمروں کو ڈرائنگ اور ڈائننگ رومز میں تقسیم کر دیجیے۔

علامہ: میں کسی قسم کے بے معنی تکلفات میں الجھنا نہیں چاہتا۔

مرزا: کبھی کبھی حکام کو آپ اپنے ہاں مدعو کر لیا کریں۔ انگریز کو رام کرنے کا بہترین طریقہ دعوت ہے۔ انگریز بڑے بڑے وعدے ایسی ہی صحبتوں میں کیا کرتا ہے اور جو تعلقات کھانے کی میز پر قائم ہوتے ہیں اس کا احترام اسے ہمیشہ ملحوظ رہتا ہے۔

علامہ: میں ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اول تو انگریز کو رام کرنے کا

سوال ہی میری دلچسپیوں کے دائرے سے باہر ہے۔ دوسرے اگر کھانا کھانے کے بعد بھی انگریز رام نہ ہوا تو اس دردسر کا فائدہ؟

☆☆☆☆☆

سفارش خودداری کے منافی

علامہ اقبال مدت العمر مختلف امتحانوں کے ممتحن رہے۔ پرچے سیٹ بھی کرتے تھے۔ صدر ممتحن بھی ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بعض اصول وضع کر لئے تھے جن پر سختی سے کاربند رہے۔

ایک بار ایک مسلم مستحق امیدوار کے فارسی کے پرچے کا مسئلہ تھا۔ مسئلہ کی سنگینی اس حد تک تھی کہ حافظ محمود شیرانی اور سر عبدالقادر جیسے ثقہ حضرات علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شیخ عبدالقادر: ڈاکٹر صاحب، اگر یہ مسلمان طالب علم فیل ہو گیا تو سٹیٹ سکالرشپ کوئی ہندو امیدوار لے جائے گا۔

محمود شیرانی: پرچہ کی طوالت کی وجہ سے اس ہونہار طالب علم سے ایک غلطی ہو گئی۔

شیخ عبدالقادر: ڈاکٹر صاحب آپ پرچہ تو دیکھئے۔

علامہ: (پرچہ دیکھ کر) آپ کے امیدوار کے چھبیس نمبر ہیں، جو مستحق ہے اسے یہ اسکالرشپ ملنا چاہیے۔ میرے کچھ اصول ہیں جن پر میں کاربند ہوں اور اپنے افعال کا جواب دہ ہوں۔ اخلاقی اعتبار سے بھی میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

اسی طرح ایک بار مولوی محمد شفیع نے کسی کی سفارش کرنے کے بارے میں استدعا کی۔

مولوی محمد شفیع: ڈاکٹر صاحب، اس معاملہ میں اگر آپ سفارش کر سکیں تو......

علامہ: آپ کو معلوم ہے کہ میں لوگوں کی سفارش نہیں کیا کرتا۔ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ایسی سفارشات شاذونادر ہی کارگر ہوتی ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنے گزشتہ گناہوں

پر پشیمان ہوں۔ تجربہ نے یہ حقیقت مجھ پر واضح کر دی ہے کہ یہ خودداری کے منافی ہے۔ بلانتیجہ سفارش کرتے جانا مجھے ذلت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

برہنہ پا استاد کے پیچھے پیچھے

علامہ اقبال کے بھانجے پروفیسر منظور احمد بیان کرتے ہیں کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں پڑھتے تھے۔ چھٹیوں میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ رحیما عطار کی دکان کے سامنے کھڑے تھے تختے پر حقہ دھرا ہوا تھا۔ علامہ حقہ پی رہے تھے، ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا۔ اتفاق سے مولوی میر حسن ادھر سے گزرے جوں ہی علامہ کی نظر ان پر پڑی، جھٹ مولوی صاحب کی طرف لپکے۔ جلدی میں پاؤں کا جوتا نکل گیا جو ذرا ڈھیلا تھا۔ وہ اسی طرح شاہ صاحب کے پیچھے ہو لئے۔ اب صورت یہ تھی کہ علامہ کے ایک پاؤں میں طلائی کام کا جوتا تھا، دوسرا خالی۔ اور وہ سر جھکائے مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ اسی حالت میں شاہ صاحب کو ان کے گھر کے دروازے تک پہنچا کے واپس آئے۔ جب دوسرا جوتا پہننے لگے تو رحیما نے کہا۔

باؤ جی: تسی تے حد کر دتی۔

علامہ: رحیمے، تجھے کیا خبر کہ شاہ صاحب کا مرتبہ کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

خوددار وکیل

قائداعظم 1946ء کے الیکشن کے سلسلہ میں کلکتہ میں مرزا ابوالحسن اصفہانی کے یہاں مقیم تھے۔ اور اس روز وہ خاص طور پر خوش تھے کیونکہ انہیں بنگال کی یونائیٹڈ مسلم پارٹی کو اس امر پر راضی کرنے میں کامیابی حاصل ہوگئی تھی کہ وہ کل ہند مسلم لیگ میں ضم ہو جائے۔ اس طرح راتوں رات مسلم لیگ سب سے بڑی اور سب سے زیادہ فعال جماعت بن گئی تھی۔ یہ بہت بڑی سیاسی کامیابی تھی۔ قائداعظم اپنے بارے میں عموماً بہت کم گفتگو کیا کرتے تھے۔ لیکن اس روز مرزا اصفہانی کے مکان کے جنوبی برآمدے میں بیٹھے وہ بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔

اصفہانی، انسان کو کامیاب لمحوں میں ناکام لمحے ضرور یاد آتے ہیں۔ آج اللہ نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے اور بحیثیت وکیل کے میں نے اتنا کچھ کمایا ہے۔ لیکن میری وکالت کا ابتدائی زمانہ بڑی سختی کا تھا۔ ہر روز میں اپنے چیمبر میں بیٹھتا تھا۔ اور اس انتظار میں صبح و شام کر دیتا تھا کہ شاید کوئی مقدمہ ملے، لیکن نہیں ملتا تھا۔ میں اتنا نو وارد اور کم عمر تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں جہاں بڑے بڑے تجربہ کار اور مشہور وکیلوں کی ریل پیل تھی، میری طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ میری طرح کے نئے وکیلوں کو عموماً کسی نہ کسی بڑے وکیل کی سرپرستی حاصل تھی۔ بڑے وکیل اپنے رشتہ داروں اور واقف کاروں کو مؤکلوں سے متعارف کرا دیتے تھے لیکن مجھے یہ آسانی بھی میسر نہیں تھی۔ اور میں نے مقدموں کو خریدنا بھی پسند نہ کیا۔

اصفہانی: مقدمے خریدنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟

قائداعظم: جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا، مقدموں کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ میرے پاس بھی دلال آتے رہتے تھے۔ اور پیش کش کرتے کہ وہ مجھے مقررہ کمیشن پر چھوٹے موٹے مقدمے دلا سکتے ہیں۔ اگرچہ میری شدید خواہش تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح کام شروع کر دوں اور کچھ کمانے لگوں خواہ کم ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں دلالوں سے کمیشن پر مقدمے لوں۔ چنانچہ ایک روز میں نے دلال سے جو پیچھے پڑا ہوا تھا، صاف کہہ دیا، مسٹر میں بھوک سے مر جانا پسند کروں گا۔ لیکن دلالی پر مقدمے ہرگز نہ لوں گا۔ خدا گواہ ہے، میں بہت پریشان تھا۔ وہ دن معاشی اعتبار سے زندگی کے مشکل ترین دن تھے لیکن میرے لئے وہ کام کرنا مشکل تھا جس کو میں جائز نہیں سمجھتا تھا۔ خدا عزمِ راسخ کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ شکر ہے کہ کچھ دنوں بعد بمبئی کے سرکاری وکیل میکفرسن نے مجھے اپنے کاغذات پڑھنے کی اجازت دے دی اور مجھے انہی کے توسط سے پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی عارضی اسامی پر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس دن سے گویا میرے دن پھر گئے۔ بعد کو مجھے یہ اسامی ایک معقول مشاہرے پر مستقل طور پر بھی پیش کی گئی لیکن جو راستہ میں نے منتخب کر رکھا تھا، اس کی راہ میں میں نے اس ترغیب کو حائل نہیں ہونے دیا۔

یہ مکالمہ اے۔ ایچ اصفہانی کی کتاب ''قائداعظم، میری نظر میں'' سے ماخوذ ہے۔

☆☆☆☆☆

پیشہ ورانہ دیانت

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری مطلوب الحسن سید نے اپنی کتاب ''ہمارے قائداعظم'' میں ایک مشہور ہندو وکیل اور سیاسی لیڈر دیوان چمن لال کے حوالے سے قائداعظم کی پیشہ ورانہ دیانت داری کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے۔ ایک مؤکل ایک روز محمد علی جناح کے پاس آیا۔

مؤکل: جناح صاحب، یہ میرے مقدمے کے کاغذات ہیں۔ آپ ان کو پڑھ کر اس کیس کے بارے میں اپنی رائے دیجئے۔

جناح: آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کے کاغذات کا مطالعہ کرنے کی فیس فی گھنٹہ کے حساب سے لی جاتی ہے۔

مؤکل: جی ہاں۔

جناح: کاغذات تو بہت زیادہ ہیں ان کا مطالعہ کرنے میں بہت زیادہ وقت لگنے کا امکان ہے۔ اس لئے اس مشورہ کی فیس بہت زیادہ ہوگی۔

مؤکل: مثلاً کتنی؟

جناح: ہوسکتا ہے کہ بات پندرہ بیس ہزار تک پہنچ جائے۔ یہ میرا اندازہ ہے۔ گو اس میں کمی بیشی بھی ہوسکتی ہے۔

مؤکل: لیکن میں صرف دس ہزار دے سکتا ہوں۔

جناح: اس طرح سودا کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے کاغذات اس مقررہ معاوضہ پر نہیں پڑھ سکتا۔

مؤکل: میں بڑی امید لے کر آیا تھا۔

جناح: قدردانی کا شکریہ۔ لیکن وکالت میں میرے کچھ اصول ہیں میں ان سے انحراف نہیں کرسکتا۔

موکل: اچھا، ایک صورت ہے۔ ان کاغذات کو آپ پڑھنا شروع کریں اور جب رقم ختم ہو جائے تو جہاں تک پڑھا ہو اسی پر رائے دے دیں۔

جناح: ٹھیک، یہ شرط منظور ہے۔

چنانچہ وکیل، محمد علی جناح نے کاغذات پڑھے، اور جب وہ شخص مقررہ وقت پر واپس آیا تو یہ گفتگو ہوئی۔

موکل: مجھے امید ہے آپ نے کاغذات دیکھ لئے ہوں گے۔

جناح: جی ہاں، میں نے سارے کاغذات دیکھ لئے۔ آپ اپیل کیجئے۔ کیس آپ کے حق میں ہے۔

موکل: آپ نے سارے کاغذات دیکھ لئے؟ میں نے صرف دس ہزار پیش کئے تھے۔

جناح: یہ دس ہزار بھی پورے نہیں ہوئے۔ اس کیس کو دیکھنے میں جو میرا وقت صرف ہوا اس کی فیس کل ساڑھے تین ہزار بنتی ہے۔ اس لئے یہ رہے آپ کی باقی چھ ہزار پانچ سو اور یہ فائل۔

موکل: لیکن سر، میں نے تو دس ہزار دینے کی حامی بھری تھی۔ آپ نے پوری فائل دیکھی ہے۔

جناح: بات پوری فائل کی نہیں، اصول کی ہے۔ جس شرط پر میں نے کاغذات پڑھنے شروع کئے تھے اس لحاظ سے میں نے اپنی فیس وصول کر لی۔ باقی آپ کی رقم آپ کو واپس کر رہا ہوں۔ شکریہ، اب اجازت دیجئے۔

☆☆☆☆☆

کبھی فیس بھی اپنے پلے سے

قائداعظم اپنے مالدار موکلوں سے بے شک فیس زیادہ لیتے تھے۔ اور اس میں کسی کی کے روادار نہیں ہوتے تھے لیکن جہاں تک غریبوں کا تعلق ہے۔ ضرورت پڑنے پر نہ صرف ان کے مقدمات کی پیروی مفت کرتے بلکہ کورٹ فیس جیسے دوسرے اخراجات بھی خود ادا کرتے۔

ایک دفعہ ایک شخص اپنا مقدمہ لے کر قائداعظم کے دفتر میں آیا۔ اور قاعدے کے مطابق پہلے ان کے منشی سے ملا۔ منشی نے ضروری کوائف معلوم کرنے کے بعد قائداعظم سے بات کی۔

منشی: ایک مؤکل ہے۔ کہتا ہے بڑی امید لے کر آیا ہوں۔ لیکن یہ شخص مطلوبہ فیس ادا نہیں کر سکتا۔

قائداعظم: کیوں؟

منشی: یہ شخص بہت غریب ہے۔ یہی جائیداد اس کا واحد سہارا ہے۔

قائداعظم: کاغذات ٹھیک ہیں؟

منشی: کاغذات ٹھیک ہیں۔

قائداعظم: فیس نہ سہی۔ کوئی بات نہیں۔ مقدمہ لے لو۔

چنانچہ منشی نے مقدمہ لے لیا۔ مگر عدالت میں اس مقدمے کا فیصلہ اس غریب مؤکل کے خلاف ہوا۔ قائداعظم کے خیال میں یہ فیصلہ درست نہ تھا۔ انہوں نے موکل سے کہا:

''تم ہائی کورٹ میں اپیل کرو، جیت جاؤ گے۔''

مگر اس کے پاس تو اپیل کی مطلوبہ کورٹ فیس بھی نہیں تھی۔ یہ جان کر قائداعظم نے تمام ضروری اخراجات خود ادا کیے۔ اور اپیل دائر کر دی۔ اور پھر مفت پیروی کی۔ اور اس بار جیسا کہ قائداعظم کا خیال تھا، مقدمہ اس کے حق میں ہوا۔ قائداعظم نے اس کو مبارکباد دی اور رخصت کیا۔

☆☆☆☆☆

اب میری حیثیت جونیئر وکیل کی ہوگی

دسمبر 1930ء میں مسلم لیگ کے جس جلسے میں علامہ اقبال نے نظریہ پاکستان پیش کیا تھا اس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر الہ آباد کے مشہور بیرسٹر سید محمد حسین تھے۔ ان کو قائداعظم کا جونیئر وکیل ہونے کا شرف بھی حاصل تھا اور کونسل آف سٹیٹ کے رکن کی حیثیت سے بھی قائداعظم کے ہمدم و دم ساز تھے۔

ایک بار بھوپال میں ایک مقدمے میں بیرسٹر سید محمد حسین کے جونیئر وکیل کی حیثیت سے پیش ہونا تھا۔ لیکن قائداعظم ٹرین لیٹ ہونے کی وجہ سے مقررہ وقت پر عدالت میں پہنچ نہیں سکے تو بیرسٹر سید محمد حسین نے مجبوراً ان کی جگہ بحث شروع کر دی۔ جب کچھ دیر بعد قائداعظم عدالت میں پہنچے تو ان کو دیکھتے ہی بیرسٹر سید محمد حسین نے اپنی بحث بند کر دی اور اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

بیرسٹر محمد حسین: معاف کیجئے جناب، آپ کی عدم موجودگی میں، مجھے بحث کا آغاز کرنا پڑا تھا اب آپ اپنی جگہ سنبھالئے، سینئر وکیل آپ ہیں۔

قائداعظم: نہیں، محمد حسین، یہ اس پیشے کے آداب کے خلاف ہے۔ آپ بحث جاری رکھیے۔ آپ کی حیثیت سینئر وکیل کی رہے گی اور میری جونیئر کی۔

یہ واقعہ قائداعظم کے مشہور محقق رضوان احمد نے بیرسٹر محمد حسین کے حوالے سے 20 نومبر 1980ء کے روزنامہ جنگ میں نقل کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ بعد کو قائداعظم نے فیس بھی جونیئر وکیل ہی کی وصول کی۔

☆☆☆☆☆

جھوٹا مقدمہ لڑنے سے انکار

یہ بمبئی کا قصہ ہے ایک مؤکل قائداعظم کے سامنے کچھ اس طرح سے رویا اور اپنی مظلومی کی داستان کچھ اس انداز میں بیان کی کہ قائداعظم نے نہ صرف اس کا مقدمہ لے لیا۔ بلکہ پہلی پیشی ہی میں اس غیر معمولی انہماک اور توجہ سے اپنے دلائل پیش کئے کہ مقدمہ کا پلہ ان کے مؤکل کے حق میں جھکتا نظر آنے لگا۔ وکیل صفائی نے لاکھ زور لگایا۔ لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ دوسری پیشی سے پہلے وہ مؤکل ان کے پاس آیا۔ بے حد شکریہ ادا کیا اور کہا:

”جیسا سنا تھا ویسا پایا۔ آپ نے بے جان مقدمہ میں جان ڈال دی۔“

”کیا مطلب؟“ قائداعظم نے پوچھا۔

”اب آپ سے کیا چھپانا۔ یہ مقدمہ میں نے ہیر پھیر کر کے دائر کیا ہے۔ آپ جیسا وکیل ہی

اس میں جان ڈال سکتا تھا''۔ موکل نے جواب دیا۔

یہ بات سن کر قائداعظم اس وقت تو چپ ہو گئے۔ لیکن جب دوسری پیشی کا وقت آیا تو قائداعظم نے جج سے کہا۔

قائداعظم: جناب والا! اس مقدمہ کو آگے بڑھانے سے پہلے میں عدالت سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔

جج: درخواست کی نوعیت کیا ہے۔ ابھی تو کارروائی شروع بھی نہیں ہوئی۔

قائداعظم: میرے مؤکل نے خود مجھے بتایا ہے کہ یہ مقدمہ جھوٹا ہے، بددیانتی سے دائر کیا گیا ہے۔ جھوٹے مقدمے کی وکالت میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔

اس ڈرامائی واقعہ سے مقدمہ کی حیثیت ہی بدل گئی۔ اس جھوٹے مقدمہ باز کو الٹی سزا بھگتنا پڑی۔

☆☆☆☆☆

صرف جائز معاوضہ

قائداعظم کے پاس ایک تاجر مقدمہ لے کر آیا۔

مؤکل: میں چاہتا ہوں کہ آپ اس مقدمہ میں میری وکالت کریں۔ آپ کی فیس کیا ہوگی؟

قائداعظم: میں مقدمے کے حساب سے نہیں، دن کے حساب سے فیس لیتا ہوں۔

مؤکل: کتنی؟

قائداعظم: پانچ سو روپے فی پیشی۔

مؤکل: میرے پاس اس وقت پانچ ہزار روپے ہیں۔ آپ پانچ ہزار روپے میں میرا مقدمہ لڑیں۔

قائداعظم: مجھے افسوس ہے کہ میں یہ مقدمہ نہیں لے سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مقدمہ طول پکڑے

اور یہ رقم ناکافی ہو۔ بہتر ہے آپ کوئی اور وکیل کر لیں۔ کیونکہ میرا اصول ہے کہ میں فی پیشی فیس لیتا ہوں۔

مؤکل: مجھے یہ شرط منظور ہے، اگر مقدمے نے طول کھینچا تو میں مزید روپے کا انتظام کر لوں گا۔ فی الحال تو پانچ ہزار حاضر ہیں۔

چنانچہ قائداعظم نے اپنی شرط پر مقدمہ لڑا۔ اور اپنی فراست سے مقدمہ تین پیشیوں ہی میں جیت لیا۔ اور فیس کے پندرہ سو روپے وصول کیئے۔ تاجر نے اس کامیابی کی خوشی میں پورے پانچ ہزار پیش کرنا چاہے تو قائداعظم نے جواب دیا۔

''میں نے اپنا حق لے لیا ہے۔''

☆☆☆☆☆

دو لاکھ ایک طرف اور دس منٹ کی تقریر دوسری طرف

پاکستان بننے سے بہت پہلے کی بات ہے کہ راجپوتانہ کے شہر جین میں ایک معذور شخص کی املاک کے سلسلے میں دو پارٹیوں میں کوئی جھگڑا چل رہا تھا دونوں پارٹیاں ہندو تھیں۔ ان میں سے ایک کے سرپرست نے قائداعظم سے وکالت کیلئے رجوع کیا۔

مؤکل: جناب، آپ نے اپیل کے کاغذات دیکھ لئے ہوں گے۔

قائداعظم: دیکھ تو لئے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ کیس نہ لے سکوں گا۔

مؤکل: کیوں جناب؟ ہم تو آپ سے بڑی امیدیں لے کر آئے تھے۔ فیس کوئی مسئلہ نہیں، ہم دو لاکھ تک پیش کر سکتے ہیں ہم چاہتے یہ ہیں کہ اپیل میں آپ ہی ہماری طرف سے کھڑے ہوں۔

قائداعظم: آپ نے غلط اندازہ لگایا۔ فیس کی رقم خواہ دو لاکھ ہو یا اس سے زیادہ، میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ اصل میں، بات کچھ اور ہے۔

مؤکل: کیا؟

قائداعظم: وہ یہ کہ جس روز اپیل ہے اسی دن مجھے اسمبلی میں ایک بحث میں حصہ لینا ہے۔ یہ

مجبوری ہے۔

اور بقول اس واقعہ کے راوی، بیرسٹر کے ایل گابا کے، وہ تقریر جو انہوں نے مقررہ دن پر اسمبلی میں کی، اور جس پر انہوں نے دو لاکھ روپے قربان کر دیئے، صرف دس منٹ کی تھی۔ لیکن بات دو لاکھ کی نہیں، اصول کی تھی۔

☆☆☆☆☆

آپ شیعہ ہیں یا سنی

کبھی ایک مذہبی اور سیاسی جماعت ''مجلس احرار'' ہوتی تھی جس کا رجحان زیادہ تر کانگریس کی طرف تھا اس لئے عام طور پر احراری کارکن مسلم لیگ اور قائداعظم کے مخالف تھے۔ اور ان سے الجھتے رہتے تھے۔ کانپور میں مسلم لیگ کا جلسہ تھا۔ قائداعظم تقریر کر رہے تھے۔ ان کو زِچ کرنے کیلئے ایک احراری کارکن اٹھ کھڑا ہوا۔

احراری: آپ شیعہ ہیں یا سنی؟

قائداعظم: پہلے میں تم سے پوچھتا ہوں، پیغمبر اسلام کیا تھے؟

احراری: وہ تو مسلمان تھے۔

قائداعظم: تو پھر میں بھی مسلمان ہوں۔

شریف الدین پیرزادہ یہ مکالمہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ایک بار قائداعظم نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک ہندو بیرسٹر مشرف بہ اسلام ہوا تو کئی مسلمان اسے مبارکباد دینے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے اس سے پوچھا، آپ شیعہ ہیں یا سنی؟

اس نے جواب دیا، ذات پات اور فرقے بازی سے نجات پانے کیلئے تو میں مسلمان ہوا ہوں۔ اور آپ پھر مجھے ان جھمیلوں میں دھکیل رہے ہیں۔

قائداعظم کے مذہبی میلانات اور رجحانات کے بارے میں شریف الدین پیرزادہ مزید لکھتے ہیں۔

قائداعظم نے 1941ء کی مردم شماری کے موقع پر قوم سے کہہ دیا تھا کہ ''وہ اپنی ذات

اور عقیدہ صرف مسلمان ہی لکھوائیں۔"

قرآنِ حکیم سے قائداعظم کو جو تعلق تھا اس کے بارے میں شریف الدین پیرزادہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر لکھتے ہیں کہ قائداعظم کے پاس قرآنِ حکیم کے چند ایک عمدہ نسخے تھے۔ ان میں سے کچھ قلمی بھی تھے۔ ایک بہترین نسخہ جزدان میں لپٹا ان کے سونے کے کمرے میں سب سے اونچی جگہ رکھا ہوتا تھا۔ ان کے اپنے مطالعے میں عموماً پکتھال کا ترجمہ شدہ قرآن مجید رہتا تھا۔ رسول کریم ﷺ کی سیرتِ پاک کے علاوہ چاروں خلفاء راشدین کی زندگیوں پر بھی انگریزی میں انکے پاس کئی کتابیں تھیں۔ شبلی کی 'الفاروق' کی پہلی جلد کا جو ترجمہ ظفر علی خان نے انگریزی میں کیا تھا اس کا مطالعہ انہوں نے بہت انہماک سے کیا تھا۔ قائداعظم حضرت عمرؓ کی ایڈمنسٹریشن کے بہت قائل تھے۔ انہوں نے کئی مسلم لیگی لیڈروں سے اپنے اس تاثر کا اظہار کیا۔

آخر میں شریف الدین پیرزادہ لکھتے ہیں کہ قائداعظم نے اقبال کے مشہور انگریزی خطبات کا مطالعہ بھی بڑے ذوق وشوق سے کیا تھا۔ مذہبی امور میں پہلے وہ نواب بہادر یار جنگ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی کو یہ امتیاز حاصل رہا۔

☆☆☆☆☆

صرف ایک فرقے کیلئے نہیں

قائداعظم ہر قسم کی فرقہ پرستی سے بلند تھے۔ بمبئی کے ایک مسلمان بینک کار نے اپنے وسائل اور اثر ورسوخ سے ۱۶ لاکھ روپے جمع کئے۔ اور ایک معیاری یتیم خانہ قائم کیا۔ وہ صاحب اس کے افتتاح کے لئے قائداعظم کے پاس آئے۔

سیٹھ: جناب والا ہم چاہتے ہیں کہ بمبئے کے سب سے بڑے اور سب سے اچھے یتیم خانے کا افتتاح آپ کے مبارک ہاتھوں سے کرائیں۔

قائداعظم: افتتاح کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن یہ بتائیے کہ یہ یتیم خانہ ہر فرقے کے مسلمان بچوں کے لئے کُھلا ہوگا یا کسی ایک فرقے کے لئے مخصوص ہوگا؟

سیٹھ: مخصوص تو ہوگا۔ ہماری برادری کے وسائل سے یہ ادارہ قائم ہوا ہے اس کے آئین

میں بھی یہ شرط رکھی گئی ہے۔

قائداعظم: تو پھر میں اس کا افتتاح نہ کر سکوں گا۔

سیٹھ: افتتاح تو ہر قیمت پر ہم آپ ہی سے کرانا پسند کریں گے۔

قائداعظم: تو پھر آپ اپنے آئین کو بدلیے اور اس کو مسلم یتیم خانہ بنائیے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سیٹھ صاحب نے ادارہ کے دستور میں ترمیم کی تو قائداعظم نے بڑے شوق سے اس کا افتتاح کیا۔ اور اس کے بانی کی بڑی تعریف کی۔

☆☆☆☆☆

گالی سے میرا کچھ نہیں بگڑتا

پاکستان بننے سے پہلے کراچی میں گرومندر ہندو اکثریت کا علاقہ تھا۔ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے کہ گرومندر کے علاقے میں کسی ہندو نے قائداعظم کو گالی دی۔ مسلم نیشنل گارڈز کو پتا چلا تو بپھر گئے۔ پندرہ بیس لڑکے وہاں پہنچے ہندوؤں سے بھڑ گئے اور ان کی خوب پٹائی کی۔ گو تعداد میں ہندو خاصے زیادہ تھے لیکن ان لڑکوں کے جوش وخروش کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ مار کھا کر انھوں نے ہاشم گزدر کو اطلاع دی کہ مسلمان لڑکوں نے ہم پر حملہ کیا ہے۔ اور ان کی قیادت سر عبداللہ کا چھوٹا بیٹا سعید اے ہارون کر رہا تھا۔ انہوں نے سعید اے ہارون کے بڑے بھائی یوسف ہارون کو فون کیا۔ کہ یہ حادثہ ہوا، یوسف ہارون نے بات قائداعظم تک پہنچادی۔ انھوں نے سعید ہارون سمیت دوسرے نیشنل گارڈز کو طلب کر لیا۔

سعید ہارون: سر ہندوؤں نے آپ کو گالی دی۔ یہ ہم سے برداشت نہ ہو سکا۔

قائداعظم: ان کے گالی دینے سے میرا کیا نقصان ہوا۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنی بڑی تحریک کو بدنام مت کرو کہیں دنیا یہ نہ کہے کہ مسلمان ایک جھگڑالو قوم ہے اور ان کا قائد اتنا چھوٹا ہے کہ گالیوں سے چھوٹا ہو جاتا ہے۔ آئندہ کبھی اس قسم کا مرحلہ پیش ہو تو اپنے رہنماؤں سے رہنمائی

حاصل کریں۔ اوران سے بغیر پوچھے اپنے طور پر کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ اگر اس مار پیٹ کے دوران کوئی مسلمان لڑکا مرجاتا تو کیا ہوتا۔ میں قوم کو مروانے کے لئے تو لیڈری نہیں کر رہا۔

یہ واقعہ سعید اے ہارون کے حوالے سے آتش فشاں کے قائد اعظم نمبر میں نقل کیا گیا۔

☆☆☆☆☆

آخری صف میں جگہ

۱۹۴۶ء میں جب قائد اعظم سیاسی مذاکرات کے لئے لندن گئے تو دوران قیام جمعہ آ گیا۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری سے کہا، میں کسی ایسی مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے سے متعلق نہ ہو۔ اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔ چنانچہ جب قائد اعظم مشرقی لندن کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے پہنچے تو خطبہ شروع ہو چکا تھا۔ لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں۔ تاکہ وہ سب سے اگلی صف میں بیٹھ سکیں۔ لیکن خود انہوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند کیا۔

حاضرین: آپ آگے تشریف لائیں۔

قائد اعظم: میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میں دیر سے آیا ہوں۔ کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔

اس واقعہ کے عینی شاہد ممتاز حسن مرحوم نے (ماہ نو ۱۹۵۴ء کے شمارے میں) مزید لکھا ہے کہ نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ قائد اعظم کو قریب سے دیکھنا اور ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ بچوں کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے ایک بوڑھا شخص رونے لگا اور کہنے لگا۔ ''اے خدا میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے''۔ یہ سارا مجمع غریب مسلمانوں کا تھا، کوئی ملاح تھا کوئی مزدور یا بس کنڈکٹر۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ممتاز حسن لکھتے ہیں:

''اس واقعہ سے جو اپنی نوعیت کا تنہا نہیں، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غریبوں سے

انہیں کتنا تعلق تھا، فرقہ بندی سے وہ کتنے بلند تھے۔ شعائر اسلام سے انہیں کتنی محبت تھی۔ قائداعظم کی عظمت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے انہیں بہت قریب سے اور مختلف مقامات پر دیکھا ہو۔''

☆☆☆☆☆

صرف اپنا نام لکھیں

اواخر ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ قائداعظم کے چھوٹے بھائی احمد علی گورنر جنرل ہاؤس میں ان سے ملنے آئے۔ اور بڑے زعم سے اپنے ملاقاتی کارڈ پر اپنے نام کے ساتھ ''قائداعظم گورنر جنرل آف پاکستان کا بھائی'' کے الفاظ لکھے اور کارڈ قائداعظم کے اے ڈی سی کیپٹن گل حسن کو دیا۔ اور کہا میں قائداعظم کا بھائی ہوں۔ آپ یہ کارڈ قائداعظم کو دکھا دیں۔ بھائی اور وہ بھی قائداعظم کا، اے ڈی سی کو کچھ لحاظ تو کرنا ہی تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً وہ کارڈ قائداعظم کے سامنے رکھ دیا۔

قائداعظم: یہ ملاقاتی کون صاحب ہیں؟

گل حسن: سر آپ کے بھائی آئے ہیں۔ یہ کارڈ انہی نے ہی دیا ہے۔

قائداعظم: ان سے کہو بغیر اپائنٹمنٹ کے میں ان سے نہیں مل سکتا۔ (جب کیپٹن گل حسن کارڈ لے کر جانے لگے تو قائداعظم کی آواز پھر گونجی)

گل حسن: لیس سر۔

قائداعظم: یہ کارڈ ادھر لاؤ۔

گل حسن: سر (کارڈ دوبارہ سامنے رکھتے ہوئے)

قائداعظم: (سرخ پنسل سے ''قائداعظم گورنر جنرل پاکستان کا بھائی'' کے الفاظ کارڈ سے کاٹنے کے بعد) ان سے کہو کہ کارڈ پر صرف اپنا نام لکھیں۔

گل حسن: بہت بہتر سر۔

کیپٹن گل حسن نے وہ کارڈ دوبارہ جا کر قائداعظم کے بھائی کو دے دیا۔ اور کہا:

''جناب یہ سرخ لکیر خود قائداعظم نے اپنے ہاتھ سے کھینچی ہے، وہ یہ فرما رہے ہیں کہ آپ کارڈ پر صرف اپنا نام لکھیں۔''

اور اپنی طرف سے یہ اضافہ کیا۔ ''آئندہ جب آپ اپنے نام کا کارڈ پیش کریں گے تو ہوسکتا ہے کہ قائداعظم آپ سے ملاقات کرلیں۔''

☆☆☆☆☆

میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے رشتہ داری کی وجہ سے تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچے

قائداعظم کی سیاسی زندگی ہر قسم کے ذاتی مفاد کے سائے سے بھی پاک تھی۔ اس سلسلہ میں وہ حد درجہ محتاط تھے۔ اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتے تھے جس سے ان کے کسی عزیز کو جائز فائدہ پہنچنے کا امکان یا شائبہ بھی ہو یا کسی کو اس کا گمان بھی ہوسکتا ہو۔ قائداعظم کے بھانجے اکبر پیر بھائی بار ایٹ لاء بمبئی میں وکالت کرتے تھے اور اچھی پریکٹس تھی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آئے اور قائداعظم سے ملے۔

قائداعظم: اب کب تک یہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟ میری قرابت داری کی وجہ سے تمہاری اور ہماری ضرورت کے باوجود تمہیں یہاں کوئی عہدہ نہیں دیا جاسکتا۔

اکبر پیر بھائی: آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ملازمت کا خواہش مند نہیں ہوں میں آپ سے الگ تھلگ رہ کر یہاں وکالت کروں گا۔

قائداعظم: مجھے معلوم ہے کہ تم اچھے وکیل ہو۔ لیکن میرے احترام کی وجہ سے اہل مقدمہ اور عدالتوں کا رجوع خارج از امکان نہیں۔ لہٰذا میں تمہیں یہاں وکالت کرنے کا مشورہ بھی نہیں دے سکتا۔

یہ سن کر اکبر پیر بھائی بمبئی واپس چلے گئے۔ اور وہاں وکالت میں بڑا نام پایا۔

☆☆☆☆☆

تو پھر یہ ملازمت آپ کو چھوڑنی پڑے گی

۱۹۴۳ء کے اواخر میں لاہور کے مشہور تاجر کتب اور ناشر شیخ محمد اشرف بمبئی گئے اور قائداعظم سے کہا، میں آپ کی سوانح عمری لکھوانا چاہتا ہوں۔ آپ کسی موزوں آدمی کا انتخاب فرمائیں۔ قائداعظم نے اس کا تذکرہ اپنے سیکرٹری مطلوب الحسن سید سے کیا۔

قائداعظم: مطلوب، شیخ اشرف میری ایک بایوگرافی لکھوانا چاہتے ہیں۔ تمہاری نظر میں کوئی موزوں آدمی ہے؟

مطلوب الحسن: سر اتنے دنوں آپ کے ساتھ رہ کر شاید میں خود اس خدمت کے لئے اوروں سے زیادہ موزوں ہوں۔

قائداعظم: اگر آپ خود یہ کام کرنا چاہتے ہیں تو پھر اللہ کا نام لے کر شروع کر دیجئے۔ لیکن ایک شرط ہے۔

مطلوب الحسن: وہ کیا؟

قائداعظم: آپ کو میری ملازمت چھوڑنا پڑے گی۔ ایک تو اس لئے کہ ملازمت میں رہتے ہوئے آپ کو وقت نہیں ملے گا۔ دوسرے بعض لوگ کہیں گے کہ یہ کتاب میں نے اپنی نگرانی میں لکھوائی ہے۔ تیسرے یہ کہ میرے ساتھ ہونے کی وجہ سے آپ غیر جانبداری سے نہیں لکھ سکیں گے۔

یہ مکالمہ خود مطلوب الحسن سید کے ایک انٹرویو سے اخذ کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

تنگدستی کے دور کی داستان

۱۹۳۸ء میں قائداعظم مسلم لیگ کو ایک عوامی جماعت بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس سلسلے میں بمبئی مسلم لیگ کے ایک نوجوان مخلص کارکن حنیف مینار اپنے والد محمد علی مینار کے ساتھ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک بار یہ گفتگو ہوئی۔

حنیف مینار: مسلم لیگ کو منظّم کرنے کی ہم کوشش تو کر رہے ہیں لیکن مشکلات بہت پیش آ رہی ہیں۔

قائداعظم: آپ ہمت نہ ہاریں اور بہتری کی امید رکھیں۔ آپ نوجوان ہیں۔ آپکو محنت، محنت اور مسلسل محنت کرنا ہوگی۔

میں بھی جب بیرسٹر بن کر ہندوستان واپس آیا تو یہاں کی قانونی فرموں پر انگریز، ان کے بعد پارسی اور پھر ہندو قابض تھے۔ یہ فرمیں اس بناء پر مجھے کیس نہ دیتی تھیں کہ میں مسلمان ہوں۔ تین برس تک یہی ہوتا رہا۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوا۔ حالانکہ بعض اوقات میرے پاس کھانا کھانے تک کے لئے بھی پیسے نہ ہوتے تھے۔ اس تنگدستی کے زمانہ میں بھی میں ہر روز عدالت میں جاتا تھا۔ وہاں مقدموں کی کاروائی سنتا چیمبر میں مطالعہ کرتا۔ خاصی تگ و دو کے بعد مجھے ایک کیس ملا۔ میں نے اس پر خوب محنت کی۔ اس کے بعد میرے پاس کیس آنا شروع ہوگئے۔ پھر میں مجسٹریٹ بھی ہوا۔ مجھے زندگی میں جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے اس میں محنت کا بہت دخل ہے۔

یہ گفتگو حنیف مینار نے ماہنامہ آتش فشاں کے قائداعظم نمبر میں نقل کی ہے۔

☆☆☆☆☆

میں سٹریٹ لائٹ میں پڑھا ہوں

قائداعظم اپنی محنت و فراست کی بدولت نیچے سے اوپر چڑھے تھے۔ اس امر کو انہوں نے کبھی چھپایا نہیں۔ بلکہ جب ذکر آتا تو بڑے فخر سے اس کا تذکرہ کرتے۔ ایک روز قائداعظم دہلی میں

لیاقت علی خان کی کوٹھی گلِ رعنا میں ٹھہرے ہوئے تھے تو کھانے کے بعد کسی طرح فضول خرچی کا ذکر چھڑ گیا۔

رعنا لیاقت علی: اس معاملے میں آپ کی احتیاط دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

قائداعظم: میں سٹریٹ لائٹ میں پڑھا ہوں اس لئے پیسوں کی قدر کرتا ہوں۔قائد اعظم کے اس قول کو خود بیگم رعنا لیاقت علی نے اپنے انٹرویو میں جو آتش فشاں کے قائداعظم نمبر میں شامل ہوا، نقل کیا۔

☆☆☆☆☆

پیدل یا بس پر

عطاء ربانی ائرفورس کی طرف سے قائداعظم کے پہلے اے ڈی سی تھے۔قائداعظم اپنے اے ڈی سی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ناشتہ پر اور کھانے پر محترمہ فاطمہ جناح کے علاوہ وہ قائداعظم کے ساتھ میز پر بیٹھتے تھے۔ایسے موقعوں پر قائداعظم اکثر ہلکی پھلکی باتیں کرتے۔کبھی کبھار اپنی زندگی کے حالات اور تجربات بھی بیان کرتے۔اسی طرح کے ایک موقع پر جب عطاء ربانی قائداعظم کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے تو یہ گفتگو ہوئی۔

قائداعظم: اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بعد عملی سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ربانی تمہارا کیا خیال ہے میں نے کہاں سے ابتداء کی ہوگی۔

عطاء ربانی: آپ ہی فرمائیں۔

قائداعظم: مجھے یہ بتانے میں کوئی عار نہیں کہ جب میں نے بمبئی میں پریکٹس شروع کی تو ہر صبح گھر سے چیمبر تک پیدل جانا پڑتا۔بس کا کرایہ ایک آنہ تھا۔ہر صبح یہ فیصلہ کرنا ہوتا کہ بس پر جانا چاہئے کہ پیدل۔سو میں سے نوے دفعہ میں نے پیدل ہی سفر کیا۔تم لوگ ہو کہ پیسے کی پرواہ ہی نہیں۔

قائداعظم کی یہ باتیں عطاء ربانی نے اپنے اس انٹرویو میں نقل کی ہیں جو آتش فشاں کے

قائداعظم نمبر میں شامل ہوا۔

☆☆☆☆☆

اجرت کانٹے کی تول، نہ کم نہ زیادہ

جب قائداعظم مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کرنے مدراس تشریف لے گئے تو واپسی میں انہیں مہاراجہ میسور کا دعوت نامہ ملا کہ اگر آپ کچھ دن میسور کے ایک پہاڑی مقام پر گزاریں تو آپ کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ اس دعوت نامے کو انہوں نے قبول کرلیا۔ چنانچہ ان کی رہائش کا انتظام ایک پہاڑی مقام نندی پر کیا گیا۔ قائداعظم تو سواری سے نندی گئے لیکن ان کا سامان قلی اٹھا کر اوپر لے گئے یہ پہاڑی کچھ ایسی اونچی نہ تھی۔ تاہم، یا تو صرف قلیوں کو خوش کرنے کے لئے یا تھوڑا سا رعب ڈالنے کے لئے قائداعظم کے سیکرٹری مطلوب الحسن سید نے انہیں چار چار روپے فی کس دیئے۔ قائداعظم نے ریسٹ ہاوس پہنچ کر پہلا سوال جو پوچھا وہ یہ تھا۔

قائداعظم: سید، قلیوں کو کیا اجرت دی؟

مطلوب الحسن: میرا خیال تھا کہ ہمارے شایان شان ادائیگی ہو۔

قائداعظم: (جھنجھلا کر) تمہارے خیال میں کیا ہم لوگ مہاراجہ ہیں؟

کچھ دنوں بعد مہاراجہ میسور نے تجویز پیش کی ''ایک اور پہاڑی جو نندی سے نسبتاً بلند ہے، آپ وہاں قیام فرمائیں''۔ چنانچہ قائداعظم اس بلند تر مقام پر منتقل ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی سامان قلیوں نے اوپر پہنچایا اور اس باران کے سیکرٹری نے انہیں صرف ایک ایک روپیہ دیا۔

قائداعظم نے نئی قیام گاہ پر پہنچتے ہی پھر پوچھا۔

قائداعظم: سید، قلیوں کی کیا مزدوری دی؟

مطلوب الحسن: جناب، ایک روپیہ فی کس ادا کیا گیا ہے۔

قائداعظم: (برہمی سے) یہ کیا ظلم کیا؟ اتنی بلندی تک سامان پہنچانے کی اجرت یقیناً زیادہ

ہونی چاہیے تھی۔ معلوم ہوتا ہے تم نے میری گزشتہ تنبیہہ کا غلط مطلب لیا۔ جاؤ، قلیوں کو بلاؤ اور پانچ روپے فی کس ادا کرو۔

(تھوڑے وقفے کے بعد) دیکھو میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ مزدوروں کو ان کا جائز حق نہ دیا جائے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ تم نوجوانوں پر واضح کر دوں کہ تم اپنے ساتھ بھی انصاف کرو اور دوسروں کے ساتھ بھی۔

نندی کی چڑھائی بہت معمولی تھی۔ وہاں چار روپے فی کس اجرت دینا فضول خرچی تھی۔ اس مقام کے پانچ روپے دینا اس لئے مناسب ہے کہ اس کی بلندی، نندی کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

یہ واقعہ خود مطلوب الحسن نے بیان کیا۔

☆☆☆☆☆

میں دُکاندار کو سبق دینا چاہتا تھا

اواخر اگست 1947ء کا واقعہ ہے کہ قائداعظم کے ایک اے ڈی سی کیپٹن این اے حسین نے کراچی کی ایک بڑی دکان سے قائداعظم کے لئے موزے خریدے۔ ان کا رنگ گرے تھا اور ان پر ویلز کا لیبل بھی لگا ہوا تھا۔ یہ موزے انہوں نے قائداعظم کے خاص پٹھان خدمت گار کے ہاتھ ان کو بھجوائے۔

دوسرے روز قائداعظم نے انہیں طلب فرمایا۔ وہ پلنگ پر تکیہ لگائے نیم دراز تھے اور پاس ہی کرسی پر محترمہ فاطمہ جناح بیٹھی تھیں۔

قائداعظم: یہ موزے آپ نے خریدے تھے؟

این اے حسین: جی ہاں۔

قائداعظم: دکاندار نے آپ سے نئے موزوں کے پیسے وصول کئے؟

این اے حسین: جی ہاں۔ میں نے ساڑھے سات روپے ادا کئے تھے۔

قائداعظم: لیکن یہ موزے تو پرانے ہیں۔ آپ دکاندار کو یہ واپس کر کے آئیں۔ اس نے آپ سے نئے موزوں کے پیسے وصول کئے اور پرانے موزے دیئے۔

چنانچہ قائداعظم کے ارشاد کے مطابق کیپٹن این اے حسین پھر بازار گئے اور دکاندار سے موزے بدلوا کر لائے اور اسی پٹھان خدمت گار کو دیئے کہ یہ صاحب کو پیش کر دینا۔ اس وقت اس نے انہیں بتایا کہ صاحب نے موزوں کو پہننے سے پہلے انہیں روشنی کے سامنے کر کے دیکھا تھا۔ ایک موزے میں سے ایک دھاگہ نکلا ہوا تھا اور ایک سوراخ نظر آ رہا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے موزے بدلوانے کو کہا تھا۔ دوسرے روز قائداعظم نے کیپٹن حسین سے پھر پوچھا۔

قائدؒاعظم: دکاندار نے موزے بدل کے دیئے تھے یا آپ بدل کر لائے تھے۔

کیپٹن حسین: سر، اس نے بدل کر دیئے تھے۔

قائداعظم: (مسکرا کر) میں دکاندار کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔

جزرسی اور پیسے کو احتیاط سے خرچ کرنا قائداعظم کے کردار کی ایک خصوصیت تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح سے روایت ہے کہ جب قائداعظم گورنر جنرل مقرر ہوئے تو ان کے کھانے کی میز پر کبھی بھی دو سے زیادہ کھانے نظر نہیں آئے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب میرے ہزاروں ہموطنوں کو ایک وقت کا کھانا میسر نہیں تو پھر مجھے طرح طرح کے کھانے پکوانا کب زیب دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

نہ رعایت لینا منظور، نہ رعایت دینے پر تیار

قائداعظم کا مطمع نظر مسلمانوں کی بہبود و ترقی تھا۔ زندگی کے جس شعبے میں کسی فرد یا ادارہ کو ترقی کرنے کی جدوجہد کرتے دیکھتے وہ اس کی ہمت افزائی ضرور کرتے۔ خواہ اس کیلئے انہیں زحمت ہی کیوں نہ اٹھانی پڑتی۔

قائداعظم کی زندگی کا ایک اور مستحکم اصول یہ تھا کہ وہ نہ کسی سے بے جا رعایت لینا پسند کرتے تھے اور نہ کسی کو بے جا رعایت دینا پسند کرتے تھے، خصوصاً پیسے کے لین دین کے معاملے

میں۔ اپریل 1944ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کے کردار کی یہ دونوں خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ اوائل 1944ء میں انارکلی، لاہور میں کپڑے کی ایک مشہور فرم کے مالک سیٹھ حاجی محمد صدیق ولی بھائی دہلی میں قائداعظم سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ آپ جب کبھی لاہور آئیں تو ہماری دکان پر بھی تشریف لائیں۔ قائداعظم یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ لاہور میں مسلمانوں کی اور وہ بھی میمن برادری کی ایک بڑی دکان ہے (واضح رہے کہ اس زمانے میں لاہور میں بھی تجارت پر غیر مسلم چھائے ہوئے تھے۔) اور فرمایا کہ اب کے لاہور آیا تو ضرور آپ کی دکان دیکھوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد حسبِ وعدہ قائداعظم دکان پر تشریف لائے اور اپنی خوشی کا اظہار فرمایا۔ چائنہ کارڈ اور خالص ریشم کے چند کپڑے پسند فرمائے۔ مالک نے یہ کپڑے تحفتاً پیش کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے صاف انکار کیا۔ اور اس شرط پر کپڑے لئے کہ ان کا بل دیا جائے۔ اس کے بعد دکان کے مالک نے خواہش ظاہر کی کہ آپ ایک شیروانی بھی ہم سے سلوائیں۔ قائداعظم شیروانی سلوانے پر اس شرط پر راضی ہوئے کہ ناپ ڈیوس روڈ پر ان کی قیام گاہ ممدوٹ ولا آ کر لیا جائے۔ کیونکہ وہ دکان پر ناپ نہیں دینا چاہتے تھے۔ دوسرے دن جب قائداعظم شیروانی کا ناپ دے چکے۔ اور حیدرآبادی بٹنوں کے سیٹ انتخاب کیلئے ان کے سامنے رکھے گئے تو یہ گفتگو ہوئی:

قائداعظم: یہ چار سیٹ ٹھیک ہیں۔ ان کا بل دے دیجئے۔ اور ہاں کپڑوں کا بل آپ نے ابھی تک نہیں دیا۔

ولی بھائی: جناب، بل کا کیا ہے، آ جائے گا۔

قائداعظم: نہیں، میں ادھار لینے کا عادی نہیں۔ ابھی بل لائیے۔ ورنہ کپڑے واپس کر دیئے جائیں گے۔

ولی بھائی: بہت بہتر جناب۔ ابھی بل پیش کرتے ہیں۔

(اپنے منیجر سے بل بنوا کر قائداعظم کو پیش کرتے ہیں)۔

یہ لیجئے جناب، ہم نے حکم کی تعمیل کر دی۔

قائداعظم: (مسکرا کر) یہ بل مناسب نہیں ہے۔ اس میں جان بوجھ کر قیمتوں کو بہت کم کر کے لکھا گیا ہے۔

ولی بھائی: یہ معمول کی رعایت ہے۔

قائداعظم: نہیں، یہ معمول کی رعایت نہیں، اس سے مختلف ہے ۔اور بہت زیادہ ہے۔ مجھے اس طرح کی رعایت پسند نہیں۔ اس بل کو دوبارہ بنوایئے۔ اور دوسرا بل بٹنوں کا کہاں ہے؟

ولی بھائی: یہ ہے جناب۔

قائداعظم: (بل دیکھ کر) ایک سیٹ میں تو تین بٹن کم تھے۔ ان کے آٹھ آنے آپ نے کم نہیں کیے۔ معاف کیجئے یہ بل بھی آپ کو دوبارہ بنانا پڑے گا۔

یہ تھا قائداعظم کی زندگی کا ایک پہلو، نہ سینکڑوں کی رعایت منظور نہ آٹھ آنے چھوڑنے پر تیار۔

☆☆☆☆☆

پیسے پیسے کا حساب

قائداعظم بہت ہی محتاط طبیعت کے آدمی تھے۔ عوام سے جو روپیہ انہیں وصول ہوتا تھا اس کا حساب رکھنے میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے۔ جب بھی انہوں نے مسلم لیگ کیلئے یا مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد کے لئے چندہ کی اپیل کی، مسلم عوام کی طرف سے اس کا بڑا حوصلہ افزاء جواب ملا۔ ۱۹۴۶ء کی انتخابی مہم کے لئے ہر روز ڈاکیہ چھوٹی بڑی، سب طرح کی رقموں کے منی آرڈر کثیر تعداد میں لایا کرتا تھا۔ قائداعظم نے اپنے سیکرٹری کو حکم دے رکھا تھا کہ ساری رسیدیں خود ان کے دستخطوں کے لئے پیش کی جائیں۔ اور پیسے پیسے کا باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ اس طرح ان کا خاصا وقت ان چھوٹی چھوٹی رسیدوں پر دستخط کرنے میں صرف ہو جاتا۔ ایک روز ان کے سیکرٹری نے کہا۔

سیکرٹری: جناب اس طرح چھوٹی بڑی رسیدوں پر دستخط کرنے میں آپ کا خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اگر رسیدوں پر دستخط کرنے کا کام کسی اور کے سپرد کر دیں تو

کیا بہتر نہ ہوگا۔ حساب کا گوشوارہ آپ دیکھ لیا کریں۔

قائداعظم: ہرگز نہیں۔ رسیدوں پر مجھے خود دستخط کرنے چاہئیں۔ اس غریب شخص کے لیے جو مجھے چار آنے بھیجتا ہے یہ رقم ایسی ہو گی جیسے دس ہزار یا بیس ہزار کا عطیہ۔ اس غریب آدمی کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس کی مدد کی قدر کرتا ہوں۔ اور اس کے عطیے کو قیمتی سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں جب میں کسی رسید پر دستخط کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے پیش نظر مقاصد کے لئے ہمیں ایک اور خیر خواہ مل گیا ہے۔ اس مسرت سے بڑھ کر مجھے اپنی قوم سے اور کونسا انعام مل سکتا ہے؟ بہر صورت چند سو رسیدوں پر دستخط کرنے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ عوام کی امداد و تائید سے لیگ کی اور میری قوت میں اضافہ ہو گا اور اپنی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے لئے ہمیں اس قوت کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک بتی بھی زائد نہیں

قائداعظم روپے کے ضیاع کے قائل نہ تھے خواہ ان کا اپنا ہو یا دوسرں کا یا حکومت کا۔ وہ اس کا بہت اہتمام کرتے تھے کہ اپنے گھر میں زائد از ضرورت بتیوں کو گل کر دیں۔ حتیٰ کہ اپنے میزبان کے گھر میں بھی وہ زائد بتیاں بجھا دیتے تھے جو ان کے لئے جلائی گئی ہوں۔ پاکستان بننے کے بعد جب قائداعظم گورنر جنرل ہاؤس میں رہتے تھے تو وہ اکثر رات کو غیر ضروری روشنیوں کو گل کر دیتے تھے۔ ایک روز ان کے سیکرٹری نے کہا۔

سیکرٹری: جناب، آپ کے اس طرح بتیاں گل کرنے سے ہمیں شرمندگی ہوتی ہے۔ یوں بھی چند بتیوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔

قائداعظم: فرق کی نہیں، اصول کی بات ہے۔ روپیہ کو ضائع کرنا ایک گناہ ہے۔ اور اگر وہ عوام کا روپیہ ہو تو اور بھی بڑا گناہ ہے۔

وہ قائداعظم جو پیسے پیسے کا حساب رکھتے تھے اور ایک پیسے کو ضائع کرنا گناہ سمجھتے تھے وہ پیسے کو فراخدلی سے صرف کرنا بھی جانتے تھے۔ اپنی وصیت میں انہوں نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی

دولت کا بڑا حصہ قومی تعلیمی اداروں کی فلاح وترقی کے لئے وقف کر دیا۔

☆☆☆☆☆

پھولوں کا تحفہ قبول، مگر روز نہیں

قائداعظم کی خودداری اس درجہ کی تھی کہ وہ کسی کا خاص طور پر ماتحتوں کا احسان لینا، خواہ کتنا ہی معمولی اور بے ضرر کیوں نہ ہو، گوارا نہیں کرتے تھے۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۸ کو بیگم میجر جنرل محمد اکبر خاں نے ڈاکٹر الٰہی بخش کے توسط سے قائداعظم کی خدمت میں انگور بھیجے۔ شام کو یہ گفتگو ہوئی۔

قائداعظم: انگور بہت اچھے تھے۔ مجھے پسند آئے۔ ایسے اچھے انگور آپ کو کہاں سے مل گئے؟

ڈاکٹر الٰہی بخش: یہ انگور بیگم جنرل محمد اکبر خاں نے میرے ہاتھ آپ کیلئے بھیجے تھے۔

قائداعظم: میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجیے گا۔

ڈاکٹر الٰہی بخش: بیگم صاحبہ ایسے انگور ہر روز بھجوا سکتی ہیں اگر آپ فرمائیں تو۔

قائداعظم: نہیں، ان کو یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر الٰہی بخش نے قائداعظم کی احسان نہ لینے کی عادت کا ایک اور واقعہ لکھا ہے۔ ایک روز انہوں نے قائداعظم کی خدمت میں چند سبز گلاب پیش کئے۔

قائداعظم: یہ سبز گلاب کی ایک نایاب قسم ہے۔ بہت خوب، شکریہ۔

ڈاکٹر الٰہی بخش: یہ پھول میجر جنرل محمد اکبر خاں کے باغیچے کے ہیں انہوں نے بطور خاص آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں اور کہا ہے کہ آپ پسند فرمائیں تو وہ ہر روز ایسے پھول بھیج دیا کریں۔

قائداعظم: اس نادر اور خوب صورت تحفہ کا شکریہ۔ جنرل کو مزید پھول بھیجنے کی زحمت نہیں دینا چاہتا۔

اگست ۱۹۴۸ء کے اواخر میں جب قائداعظم زیارت سے کوئٹہ آ گئے تھے تو چند دنوں کے بعد ان کی طبیعت قدرے سنبھلنے لگی۔ ایک روز ایک عرصے کے بعد انہوں نے سگریٹ پینے کی خواہش ظاہر کی۔ جس کی اجازت ڈاکٹروں نے دے دی۔ اتفاق سے قائداعظم کے پسندیدہ برانڈ کریون اے کے ڈبے ڈاکٹر الٰہی بخش کے پاس موجود تھے۔ انہوں نے ایک ڈبہ بھجوا دیا۔ شام کو یہ باتیں ہوئیں۔

ڈاکٹر الٰہی بخش: جناب، سگریٹ آپ کو پسند آئے۔ تازہ تو تھے؟

قائداعظم: شکریہ۔ ہاں ٹھیک ہیں۔

لیکن دوسرے روز یہ مکالمہ ہوا؟

ڈاکٹر الٰہی بخش: سر، رات کیسے گزری؟ کوئی سگریٹ لیا؟

قائداعظم: یہ سگریٹ کچھ بے مزہ ہو گئے ہیں۔ کیا لاہور سے تازہ منگوائے جا سکتے ہیں؟

ڈاکٹر الٰہی بخش: کیوں نہیں۔ میں آج ہی لکھتا ہوں۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر الٰہی بخش اپنی کتاب ''قائداعظم کے آخری ایام'' میں لکھتے ہیں۔

''پہلے تو میں حیران ہوا کہ رات بھر میں یہ سگریٹ بے مزہ کیسے ہو گئے۔ لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ اصل میں قائداعظم میرا احسان لینے سے بچنا چاہتے تھے۔ یہ ان کی ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ وہ کوئی چیز بلا قیمت کبھی قبول نہیں کرتے تھے۔''

☆☆☆☆☆

قوم کی خدمت، قوم پر بوجھ بنے بغیر

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، لاہور کے طلبہ نے مارچ ۱۹۴۱ء میں ایک خصوصی پاکستان سیشن کا اہتمام کیا۔ اور قائداعظم کو اپنے مہمان کے طور پر فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرایا۔ سیشن بہت کامیاب رہا۔ دوقومی نظریے کی خوب تشہیر ہوئی۔ چند روز قیام کے بعد قائداعظم نے روانگی کے مقررہ وقت سے پہلے مینجر سے بل منگوایا اور ادا کر دیا۔ جب طالب علم منیجر کے پاس میزبانی کے مصارف ادا کرنے پہنچے تو منیجر نے بتایا کہ بل تو قائداعظم ادا کر چکے ہیں۔ مجلس استقبالیہ کے اراکین کچھ شرمندہ سے ہوئے اور قائداعظم کے کمرے میں پہنچے۔

اراکین: جنابِ والا، یہ آپ نے کیا کیا؟ ہم آپ کے میزبان ہیں۔ بل کی ادائیگی ہمیں کرنا تھی۔

قائداعظم: میں ایسا سیاست دان نہیں ہوں جو اپنی جیب سے خرچ نہ کر کے مسلمان قوم کی خدمت کرے۔

یہ واقعہ طلبہ کے وفد کے ایک رکن جسٹس ذکی الدین پال نے بیان کیا۔ حقیت یہ ہے کہ اپنی طویل سیاسی زندگی میں قائداعظم نے قومی وسائل سے اپنا جائز حق بھی وصول نہیں کیا۔ بلکہ وہ سیاست میں آئے بھی اس وقت جب وہ اپنی معاشی حالت مستحکم کر چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

سرکاری سرمایہ ایک امانت

پاکستان بننے کے بعد جب قائداعظم پہلی بار مشرقی پاکستان جانے لگے تو مسئلہ اٹھا کہ گورنر جنرل کا دقیانوسی ڈکوٹہ جہاز لاہور سے ڈھاکہ براہ راست پرواز نہیں کر سکتا تھا۔ اسے تیل لینے کے لئے راستہ میں لازمی طور پر دہلی میں رکنا پڑتا۔ قائداعظم نہیں چاہتے تھے کہ سرزمینِ ہند پر اس طرح قدم رکھیں۔ قائداعظم نے اپنے سیکرٹری کو بلایا۔

قائداعظم: کوئی ایسا انتظام نہیں ہو سکتا کہ جہاز بیچ میں اترے بغیر سیدھا ڈھاکہ چلا جائے۔

سیکرٹری: یہ ڈکوٹہ تو ایسا نہیں کر سکتا۔ متبادل صورت یہ ہے کہ کے۔ ایل۔ ایم کے مخصوص طیارے سے سفر کیا جائے۔

قائداعظم: اس کا کرایہ کتنا ہوگا؟

سیکرٹری: آمدورفت پر تقریباً سات لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔

قائداعظم: اس وقت سرکاری خزانہ اس خرچ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ کوئی اور صورت نکالو۔ آخر ڈکوٹہ میں کمی کیا ہے؟

سیکرٹری: اس کی تیل سٹور کرنے کی صلاحیت محدود ہے۔ اس لئے دہلی میں اس کے لئے رکنا لازمی ہے۔

قائداعظم: اگر اتنی سی بات ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ آپ ڈکوٹہ میں ایک فالتو ٹینکی لگوانے کا انتظام کیجیے۔ میں نہ دہلی میں اترنا چاہتا ہوں نہ مخصوص طیارہ کرایہ پر لینا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس واقعہ کے راوی نواب صدیق علی خان ''بے تیغ سپاہی'' میں لکھتے ہیں کہ ماہرین اس تجربے کے حق میں نہیں تھے۔ لیاقت علی خاں کی رائے بھی اس کے خلاف تھی۔ لیکن قائداعظم نے ضروری انتظام کروا کر اپنے پروگرام کے مطابق اسی ڈکوٹہ سے، بغیر راستہ میں رکے، مشرقی پاکستان تک سفر کیا۔

یہ مثال صرف جرأت ہی کی نہیں بلکہ سرکاری سرمائے کو بے ضرورت صرف نہ کرنے کے اصول کی بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

ہندو بے شک اپنے وعدے بھلا دے لیکن ہمیں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہیے

تشدد سے تشدد پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان بنتے وقت اور اس کے فوراً بعد دہلی، یوپی اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر ہندوؤں نے جو ہولناک مظالم ڈھائے تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ان مظالم کی داستانیں ان علاقوں کے مہاجروں کے ساتھ جب کراچی پہنچیں تو کراچی کے مسلمانوں کا خون کھول اٹھا۔ اور وہ مشتعل ہو کر اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام کراچی کے ہندوؤں اور سکھوں سے لینے لگے۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے پہلے ہفتے میں اس انتقام نے ایک فساد کی صورت اختیار کر لی۔

قائداعظم کو جب اس صورتحال کی اطلاع ملی تو انہوں نے کراچی نیشنل گارڈز کے عہدیداروں کو اپنے ہاں بلایا۔ ان میں سعید عبداللہ ہارون بھی شامل تھے۔

قائداعظم: مجھے بہت دکھ ہوا ہے کہ پاکستان کے دارالحکومت میں ہندوؤں پر ہاتھ اٹھایا جائے اور نیشنل گارڈز منہ تک رہے ہوں۔ جب کہ اقلیتوں کی حفاظت کرنا آپ کے فرائض میں بھی شامل ہے۔

سعید ہارون: جناب والا، دلی میں اتنے مسلمان مارے گئے ہیں۔ وہ بھی ہندوؤں کا دارالحکومت ہے۔

قائداعظم: اگر بھارت کی حکومت مسلمانوں کی حفاظت نہیں کر سکی اور اپنی زبان پر قائم نہیں رہی تو بھی میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ کل کوئی طعنہ دے کہ میں اور حکومت پاکستان اقلیتوں کی حفاظت نہ کر سکے۔ ہندو اپنے وعدے بیشک بھلا دے لیکن ہمیں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہیئے۔

اس گفتگو کو نقل کرتے ہوئے سعید اے ہارون لکھتے ہیں کہ قائداعظم کا حکم سننے کے بعد ہمارے لئے اس کی تعمیل کئے بغیر چارہ نہ تھا۔

☆☆☆☆☆

کم ظرفی کا جواب کم ظرفی نہیں

قائداعظم بڑے بااصول اور عالی ظرف انسان تھے۔ اور سیاست میں بھی اصولوں کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں ہندوؤں کا تعصب انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ تعلیمی ادارے بھی اس کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ ہندوؤں نے الہ آباد یونیورسٹی کے ہال پر کانگریس کا جھنڈا لہرا رکھا تھا جو مسلمانوں کو مسلسل مشتعل کر رہا تھا۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں پنجاب یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین کا انتخاب ہوا تو اس کا صدر قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

صدر: جناب والا ہندوؤں نے الہ آباد یونیورسٹی پر کانگریس کا جھنڈا لہرا رکھا ہے۔ اب ہمیں اس کا بدلہ لینے کا موقع ملا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ اپنے ہاتھ سے پنجاب یونیورسٹی پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کی رسم ادا فرمائیں۔

قائداعظم: میں اس طرح کی جوابی کارروائی کو پسند نہیں کرتا۔ جس کام کے لئے ہم دوسروں کو ملعون کرتے ہیں وہ خود کیوں کریں؟ تمہاری کامیابی باعث مسرت ہے لیکن ہمارا ظرف بڑا ہونا چاہیے۔ طاقت حاصل کر کے اپنی قوت کی اس طرح نمائش نہ کرو کہ دوسروں کی دل آزاری ہو۔

☆☆☆☆☆

ایک ہندو کی دیکھ بھال کر کے آپ بہت اچھا کر رہے ہیں

پاکستان بنتے وقت مشرقی پنجاب، مغربی یوپی اور راجپوتانے کی ریاستوں کے مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور جس حالت زار میں مہاجرین لاکھوں کی تعداد میں پاکستان پہنچے۔ اس کے نتیجے میں جنوری 1948ء میں ہندو مسلم فساد ہوگیا تو بازار بند ہوگئے اور کھانے پینے کی چیزیں ملنے میں دقت ہونے لگی۔ ہندو تو خاص طور پر گھروں میں بند ہو گئے تھے۔ اور احتیاطاً گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔ کراچی کا ایک ہندو تاجر اور موٹر ایجنٹ کشو گڈوانی تھا جسے قائداعظم بھی جانتے تھے۔ اس سے قائداعظم کے اے ڈی سی کیپٹن گل حسن کے مراسم بھی تھے۔ انہوں نے ازراہ انسانی ہمدردی کئی روز تک کشو گڈوانی کے گھر کھانے پینے کا ضروری سامان بھجوایا بلکہ چند دن تو خود سامان لے

کر گئے۔ قائداعظم کو جب اس امر کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کیپٹن گل حسن سے یہ دوٹوک باتیں کیں۔

قائداعظم: گل حسن، آپ ہر روز شام کو کشوگڈوانی کے ہاں جاتے ہیں؟

گل حسن: جی جناب؟

قائداعظم: آپ اس کیلئے کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے جاتے ہیں؟

گل حسن: جی ہاں، وہ لوگ گھروں میں بیٹھے ہیں اس لئے کھانے کی چیزوں کی پرابلم ہے۔ میں ان کیلئے اشیائے خوردونوش اور سبزی وغیرہ ضرور پہنچاتا رہا ہوں۔

قائداعظم: مجھ سے کسی نے اس امر کی شکایت کی تھی لیکن میں نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ آپ گڈوانی کو کھانے پینے کی چیزیں ضرور پہنچاتے رہیں۔ یہ آپ بہت اچھا کررہے ہیں۔ تمام اقلیتیں پاکستان کی شہری ہیں۔ ہمارے پرچم میں سفیدی اقلیتوں کے حقوق اور جان و مال کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اگر ہم اقلیتوں کا تحفظ نہیں کرسکتے تو پھر قومی جھنڈے میں سفید پٹی رکھنے کا جواز کیا ہے۔

یہ مکالمہ خود کیپٹن (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ) گل حسن نے اپنے اس انٹرویو میں نقل کیا جو مئی 1978ء کے آتش فشاں میں شائع ہوا۔ جنرل گل حسن نے اپنے انٹرویو میں اس زمانے میں کشوگڈوانی سے ہونے والی اپنی ایک گفتگو بھی نقل کی ہے۔ گڈوانی ایک کار ایجنٹ تھا۔ ایک روز وہ ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

ایک اچھی گاڑی آٹھ ہزار میں مل رہی ہے۔ آپ کیوں نہیں خرید لیتے؟ دس ہزار میں بک جائے گی۔''

انہوں نے جواب دیا ''میرے پاس آٹھ ہزار کیا آٹھ روپے بھی نہیں، آپ آٹھ ہزار کی بات کررہے ہیں۔'' گڈوانی کہاں جان چھوڑنے والا تھا۔ اس نے پتہ پھینکا۔

''میں آپ کیلئے فنانسر کا بندوبست کرتا ہوں۔''

ان کا جواب تھا ''نہ بابا نہ، اگر قائداعظم کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے جیل بھجوا دیں گے۔''

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد قائداعظم کے سابق اے ڈی سی جنرل گل حسن کہتے ہیں۔اگر کسی سے کوئی اتفاقیہ غلطی ہو جاتی تو قائداعظم معاف کر دیتے تھے۔لیکن جب کوئی جان بوجھ کر غلطی کرتا تو وہ کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ وہ خود اتنے کھرے اور بے لاگ تھے کہ ان کا ماتحت عملہ کبھی کوئی غلط قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

ذہانت نہیں، راست بازی

مشہور کشمیری رہنما چودھری غلام عباس، مسٹر اے آر ساغر اور پروفیسر محمد اسحاق قریشی سیاسی رہنمائی کیلئے قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں قائداعظم ممدوٹ ولا، لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ملکی سیاست اور کشمیر کے حالات پر طویل گفتگو ہوئی۔ اس ملاقات کے دوران ایک موقعہ ایسا آیا کہ چودھری غلام عباس نے قائداعظم کی سیاسی کامیابیوں کی پرجوش اور پرخلوص تعریف کی اور کہا۔

چودھری غلام عباس: یہ سب آپ کی ذہانت اور فراست کا نتیجہ ہے۔

قائداعظم: (قدرے چونک کر) میرے دشمن میرے بارے میں جو بھی خیال کریں، ان کو حق ہے۔لیکن میرے دوستوں کو علم ہونا چاہیے کہ محمد علی جناح نے کانگریس کو جس سیاست سے ہر قدم پر مات دی ہے اس کا نام راست بازی اور سچائی ہے۔

کانگریس اور گاندھی کی سیاست کا نام عیاری ہے۔لہٰذا میں نے اس کا تریاق راست بازی میں ڈھونڈ لیا ہے۔

اس واقعہ کو پروفیسر محمد اسحاق قریشی نے 25 دسمبر 1947ء کے نوائے وقت میں لکھا۔

☆☆☆☆☆

میں تجاوز پسند نہیں کرتا

پنجاب کے مشہور مسلم لیگی کارکن ملک برکت علی قائداعظم اور لیگ کے بہت وفادار اور فعال کارکنوں میں سے تھے۔ قائداعظم بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ 1946ء کے انتخابات کے بعد ایک موقعہ پر یونینسٹ پارٹی کے ایک مقتدر لیڈر اور مسلم لیگ میں مذاکرات کی صورت پیدا ہوئی۔ ملک برکت علی کی دعوت پر قائداعظم لاہور تشریف لائے۔ ملک برکت علی نے ایک چائے کی دعوت کا اہتمام کیا جس میں قائداعظم کے سامنے جو کیک رکھا گیا وہ ہندوستان کے نقشے کے مطابق بنایا گیا۔ اور اس میں پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کا رنگ سبز تھا۔ جب قائداعظم نے کیک کاٹا تو بڑی احتیاط سے کیک کا سبز حصہ الگ کر دیا۔ یہ دیکھ کر کسی نے کہا۔

حاضرین: جناب والا، یہ ذرا سا حصہ اور کاٹ دیجیے۔

قائداعظم: میں تجاوز کسی صورت میں پسند نہیں کرتا۔

یہ واقعہ ملک برکت علی مرحوم کے صاحبزادے ملک افتخار علی نے 25 دسمبر 1947ء کے نوائے وقت میں لکھا۔

☆☆☆☆☆

عید نہ ملنے کا سبب

ایک بار قائداعظم دلی میں تھے۔ قائداعظم نے عید کی نماز دلی کی مشہور جامع مسجد میں ادا کی۔ مسجد میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ جب لوگوں نے انہیں پہچانا تو لوگوں میں بڑا جوش وخروش پھیل گیا۔ قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ اتنے میں دلی کے ایک سربرآوردہ لیگی لیڈر آگے بڑھے۔

لیگی لیڈر: جناب عید مبارک!

قائداعظم: آپ کو بھی عید مبارک۔ لیکن معاف کیجیے میں آپ سے گلے نہیں مل سکتا۔

یہاں سب مسلمان برابر ہیں۔ اگر میں آپ سے گلے ملوں تو میرا اخلاقی فرض ہوگا کہ میں فرداً فرداً ہر ایک سے معانقہ کروں۔ جو میرے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے میرے لئے محفوظ راستہ یہی ہے کہ میں کسی سے معانقہ نہ کروں مجھے امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔

☆☆☆☆☆

ضمیر کی آواز

جب بمبئی کے ایک سربرآوردہ تاجر احمد ای ایچ جعفر مرکزی مجلس قانون ساز ہند کے ممبر منتخب ہوئے تو نسبتاً کم عمر تھے۔

قائداعظم: جعفر، میں تمہیں مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے پر مبارک باد دیتا ہوں۔

احمد جعفر: شکریہ جناب، لیکن میں تو اس میدان میں نووارد ہوں۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔

قائداعظم: اگر تم کبھی اسمبلی میں میرے خلاف بھی ووٹ دو تو میں بُرا نہیں مانوں گا۔ اپنے ووٹ کے حق کو جس طرح تم صحیح سمجھتے ہو، ضرور استعمال کرو۔ لیکن یاد رکھو کبھی اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف نہ جانا۔ اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو صحیح ہے تو پھر ذرا جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر محسوس کرو کہ جو راستہ تم اختیار کرنا چاہتے ہو اس میں کسی غرض کا شائبہ ہے تو اس راستہ سے گریز کرنا۔

میں تمہیں بتاؤں۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ لوگ کیا کہتے ہیں، اور کیا نہیں کہتے اس کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ میں نے وہی کیا جو میرے ضمیر نے کہا۔ اگر تم نے میرے مشورے کو قبول کیا تو کندن بن جاؤ گے۔ اس مشورہ کا اطلاق صرف مرکزی اسمبلی کی کارروائی پر ہی نہیں ہوتا۔ عہدوں کے پیچھے نہ بھاگو، عہدوں کو اپنے پیچھے بھاگنے دو۔

☆☆☆☆☆

ہتک

قائداعظم فرمایا کرتے تھے کہ قوم کی زندگی اور ترقی کیلئے ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص بلالحاظ مرتبہ وحیثیت خود کو قوم کے مفاد کا نگہبان و محافظ سمجھے۔ اور اگر کسی کو ایسی حرکت کا مرتکب پائے جس سے قوم یا ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اپنے آرام وسہولت کو نظرانداز کر کے مرتکب کو کیفر کردار تک پہنچائے۔

اس اصول پر وہ خود بھی کاربند تھے۔ اس کی تصدیق ان کی زندگی کے اس دور کے ایک واقعہ سے ہوتی ہے جب وہ زیادہ مشہور نہیں تھے۔ اور بمبئی سے باہر بہت کم لوگ انہیں جانتے پہچانتے تھے۔

انہیں کہیں جانا تھا۔ حسب عادت انہوں نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا۔ اور ڈبے میں بیٹھ گئے۔ جب منزل مقصود کے قریب پہنچے اور ٹکٹ کی ضرورت پیش آئی تو یاد آیا کہ ٹکٹ تو اتفاق سے ملازم کے پاس رہ گیا۔ خیر اب کیا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ وہ ٹکٹ کلکٹر کے پاس پہنچے اور یہ گفتگو ہوئی۔

جناح: میں نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اتفاق سے ملازم کے پاس ہی رہ گیا ہے۔ آپ فی الحال مجھ سے کرایہ وصول کر لیجئے۔ میں بعد کو خریدے ہوئے ٹکٹ کے داموں کی واپسی کا مطالبہ کرلوں گا۔

ٹکٹ کلکٹر: بابو، کرایہ کیا وصول کرنا ہے، سیدھے ہاتھ سے دو روپے میرے ہاتھ پر رکھو اور سٹیشن سے باہر چلے جاؤ۔

جناح: کیا کہا؟ دو روپے دوں اور سٹیشن سے باہر چلا جاؤں؟ یہ کہہ کر تم نے میری ہتک کی ہے۔

ٹکٹ کلکٹر: ہتک کی کیا بات ہے؟ جا بابا، جان چھوڑ۔

جناح: تم نے قابل تعزیر حرکت کی ہے۔ اپنا نام اور پتہ بتلاؤ، میں تمہیں یوں نہ چھوڑوں گا۔

یہ بحث سن کر دوسرے مسافر بھی جمع ہو گئے۔ بعض نے ان پر فقرے بھی کسے کہ بڑا ایماندار بنتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کی جان نہ چھوڑی۔ معاملہ اوپر تک پہنچا اور وہ بد دیانت ٹکٹ کلکٹر بالآخر برخاست ہو گیا۔

یہ واقعہ خود قائداعظم نے اپنے قول کی وضاحت کرتے ہوئے عزیز احمد کو بتایا۔

☆☆☆☆☆

میں خیانت کیسے کروں؟

ایک دفعہ قائداعظم کسی کیس کے سلسلے میں آگرہ تشریف لائے۔ مسلم لیگ کے کارکنوں کو خبر ہوئی تو وہ ان کی خدمت میں پہنچے۔

کارکن: جناب والا، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ آگرہ تشریف لائے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آگرہ مسلم لیگ کی طرف سے ایک بڑا جلسہ کریں۔ اور آپ اس میں تقریر فرمائیں۔ آگرے میں پاکستان کے مخالفوں کو منہ کی کھانی پڑے گی۔

قائداعظم: میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ اس جلسے سے پاکستان کی تحریک کو جو تقویت پہنچے گی اس کی اہمیت اور ضرورت کا بھی مجھے احساس ہے۔ اس کے باوجود میں اس جلسے میں تقریر نہیں کر سکوں گا۔

کارکن: (تعجب سے) کیوں؟ کیا ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے؟

قائداعظم: نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

کارکن: تو پھر کیا وجہ ہے؟ ارشاد فرمائیں۔

قائداعظم: وجہ ایک اصولی بات ہے۔

کارکن: جی۔

قائداعظم: دیکھئے میں یہاں اپنے مؤکل کی طرف سے پیش ہونے آیا ہوں جس کی وہ فیس

ادا کر رہا ہے۔ میں خیانت کیسے کروں؟ آپ جلسہ کرنا چاہتے ہیں، ضرور کریں۔ بعد میں بلالیں۔ میں اپنے خرچ پر آؤں گا۔

''دی گریٹ لیڈرز'' میں یہ واقعہ مختار زمن نے اپنے والد کے حوالہ سے جو اس زمانہ میں آگرے میں جج تھے، بیان کیا۔

☆☆☆☆☆

سیاست میں بھی اصولوں کی برتری

سیاست میں بھی اصولوں کی برتری کو قائم رکھنا قائداعظم ہی کا کام تھا۔ 1946ء کے اوائل کا ذکر ہے کہ بنگال میں قائداعظم کے خاص رفیق کار مرزا ابوالحسن اصفہانی کلکتے کی ایک سیٹ کے لئے مسلم لیگی امیدوار تھے اور خیال تھا کہ وہ بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں گے۔ عین وقت پر ایک حریف نے کاغذات نامزدگی داخل کرا دیئے۔ اور ترغیب اور دباؤ کے باوجود دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ اصفہانی کے قریبی دوست اور ایک ممتاز مسلم لیگی سیاستدان عبدالرحمٰن صدیقی نے بڑی کاوشوں سے اسے شیشے میں اتارا۔ اور اسے نام واپس لینے پر آمادہ کرلیا۔ یہ اچھی خبر لے کر صدیقی اصفہانی کے یہاں پہنچے۔ اس زمانے میں قائداعظم بھی اصفہانی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے یہ گفتگو ہوئی۔

صدیقی: اصفہانی مبارک ہو، بالآخر بات بن گئی۔ وہ شخص اپنا نام واپس لینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ بڑے طویل مذاکرات کرنے پڑے۔

اصفہانی: خدا کا شکر ہے، یہ مرحلہ طے ہوا۔

صدیقی: لیکن اس کی ایک معمولی سی شرط ہے۔

اصفہانی: وہ کیا؟

صدیقی: وہ یہ کہ تم اڑھائی سو روپے کا وہ زرضمانت اس کو دے دو جو اس نے نامزدگی کے کاغذات داخل کرتے وقت جمع کرایا تھا۔

قائداعظم: صدیقی برائے کرم ذرا دہرائیے کہ آپ نے کیا کہا۔ میں نے ٹھیک طرح سنا نہیں۔

صدیقی: میں نے عرض کیا تھا کہ اصفہانی کا مدمقابل الیکشن سے اپنا نام واپس لینے کیلئے تیار ہو گیا ہے۔ لیکن وہ اڑھائی سو روپے مانگتا ہے جو اس نے زرضمانت کے طور پر خزانے میں جمع کرائے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم روپیہ دے دیں تو جان چھوٹ جائے گی۔

قائداعظم: (تیزی سے) روپیہ دے دیں؟ کسی امیدوار کو نام واپس لینے کیلئے بالواسطہ رشوت دی جائے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اس سے فوراً کہہ دو کہ اس کی یہ پیشکش رد کی جاتی ہے۔ اصفہانی انتخاب لڑیں گے، ایسا بھی کیا ہے۔

صدیقی: بہت بہتر جناب، میں ابھی جاتا ہوں۔

قائداعظم: (اصفہانی سے) بیٹا، آدمی یہی جواب دے سکتا ہے۔ سیاست میں اخلاقی استواری نجی زندگی کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ اگر تم سیاسی معاملات میں کسی غلطی کے مرتکب ہو گئے تو تم بہت سے ایسے لوگوں کو نقصان پہنچاؤ گے جو تم پر اعتماد کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سیاسی جوڑ توڑ سے گریز

سیاست میں قائداعظم کسی جوڑ توڑ کے قائل نہیں تھے۔ اس اصول پر وہ خود بھی عمل پیرا تھے۔ 1946ء میں جناح بمبئی کے مسلمان حلقے سے مرکزی مجلس قانون ساز کی رکنیت کیلئے امیدوار تھے۔ اسی حلقے سے مسٹر صالح بھائی اور مسٹر حسین بھائی لال جی نے بھی کاغذات نامزدگی داخل کرا دیئے۔ انہوں نے اپنی انتخابی مہم چلانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ووٹ دینے والے مجھے جانتے ہیں اور دوسروں کو بھی، اس لئے مجھے در در پھرنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال ووٹنگ شروع ہوئی تو چند گھنٹے کے بعد ہی ان کے حریفوں کو پتہ چل گیا کہ ان کیلئے عافیت اسی میں ہے کہ اب بھی بیٹھ جائیں۔ دوپہر سے پہلے مسٹر صالح بھائی قائداعظم کے پاس آئے۔

صالح بھائی: جناح صاحب! میں آپ کے حق میں دست بردار ہونے کو تیار ہوں لیکن اگر آپ محض رسمی طور پر مجھ سے نام واپس لینے کی درخواست کر دیں تو میرے لئے اپنا نام واپس لینا آسان ہو جائے گا۔

جناح: میں آپ کے جذبۂ خیر سگالی کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اصولاً میرے لئے آپ سے یہ درخواست کرنا ممکن نہیں۔ آپ دن ختم ہونے تک مقابلہ جاری رکھیں تو میں اس کا بُرا نہ مانوں گا۔

چنانچہ ایک اصول کی خاطر قائداعظم نے صالح بھائی سے اپنے حق میں بیٹھ جانے کی درخواست نہیں کی۔ لیکن ان کا معذرت کرنے کا انداز اتنا مؤثر تھا کہ آدھ گھنٹے کے اندر صالح بھائی خود ہی بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے دوسرے حریف مسٹر حسین لال جی بھی ان کے پاس آئے۔

حسین بھائی: مسٹر جناح میں یہ پسند کروں گا کہ میں آپ کے حق میں اپنا نام واپس لے لوں۔

جناح: مسٹر لال جی، فیصلہ آپ کا اپنا ہے۔ اگر آپ بیٹھنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو روک نہیں سکتا۔

حسین بھائی: لیکن ایسا کرنے کیلئے مجھے کوئی بہانہ چاہیے۔ تاکہ میری بات بھی رہ جائے۔

جناح: آپ کا کیا مطلب ہے؟

حسین بھائی: اگر آپ مجھ سے رسمی سے درخواست کریں تو میں اسی وقت بیٹھنے کو تیار ہوں۔

جناح: مسٹر لال جی، بہتر ہوگا کہ آپ مقابلہ جاری رکھیں۔ میرے لئے آپ سے نام واپس لینے کی درخواست ممکن نہیں۔ ویسے، آنے کی زحمت کرنے کے لئے بہرحال میں آپ کا ممنون ہوں۔

☆☆☆☆☆

بددیانتی کی نسبت ہار جانا بہتر ہے

جنگ، محبت اور سیاست میں لوگ سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن قائداعظم کا کردار مختلف تھا۔ وہ سیاست میں بھی دیانت داری کو مقدم سمجھتے تھے۔ اور اس اصول پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ 1946ء کے انتخابات سر پر تھے جو پاکستان کیلئے ریفرنڈم کی حیثیت رکھتے تھے۔ سندھ اسمبلی میں مسلمانوں کی 35 نشستیں تھیں قائداعظم نے لیگ کے امیدواروں کی مدد کیلئے سات ممبروں کی۔ ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی اور جی الانہ کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس کے چیئرمین یوسف اے ہارون تھے۔ قائداعظم نے جی الانہ کو انتخابی مہم کیلئے کثیر رقم دی۔ اور اراکین پر اس انتخاب کی اہمیت واضح کر کے خود انتخابی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کیلئے دوسرے صوبوں میں تشریف لے گئے۔ پولنگ سے تقریباً چار ہفتے پہلے قائداعظم کراچی تشریف لائے۔ اور جی الانہ سے یہ گفتگو ہوئی۔

قائداعظم: حصول پاکستان کی جدوجہد میں سندھ ایک اہم صوبہ ہے اس صوبے میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی 35 نشستیں حاصل کرنا چاہئیں تاکہ یہاں لیگی وزارت بنائی جاسکے۔ الانہ، میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم مجھے صحیح صورتحال سے آگاہ کرو کہ صوبہ کی انتخابی مہم کس طرح چل رہی ہے؟

جی الانہ: جناب، میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق شاید ہم 35 میں سے 5 نشستیں نہ جیت سکیں۔

قائداعظم: سندھ اسمبلی میں کل 60 نشستیں ہیں۔ اگر ہم 35 مسلم نشستوں میں سے 35 نہ جیت سکے تو وزارت کس طرح بنا سکیں گے؟ یہ صورتحال تو بہت تشویشناک ہے۔

جی الانہ: انتخابی کمیٹی کو بھی یہی پریشانی ہے۔

قائداعظم: لیکن یہ پانچ نشستیں کون سی ہیں؟ اور ان کو حاصل نہ کرسکنے کے کیا اسباب ہیں؟

جی الانہ: ہمارے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ روپے کی کمی ہے۔ سندھ کے ہندوؤں کے ہاتھ میں موٹر ٹرانسپورٹ اور پٹرول پمپ ہیں۔ جب تک ہم لیگ کے امیدواروں کیلئے پٹرول اور گاڑیاں مہیا نہ کریں گے ان کی کامیابی

غیر یقینی رہے گی۔

قائداعظم: تمہیں اور کتنی رقم درکار ہے؟

جی الانہ: ہمیں کم از کم ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔

قائداعظم: میرے پاس جو روپیہ ہے وہ میرا ذاتی نہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی امانت ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ روپے پر ہمیں سولہ آنے فائدہ ہو۔

جی الانہ: جی۔

قائداعظم: میں سودے بازی نہیں کر رہا۔ آپ مزید پچاس ہزار لے لیجئے۔ اور مجھے یقین دلا دیجئے کہ ہم تمام 35 نشستیں حاصل کر کے رہیں گے۔

جی الانہ: ہم ہر ممکن کوشش کریں گے اور انشاء اللہ تمام نشستیں حاصل کر کے رہیں گے۔

قائداعظم: ہاں، ان مشکل نشستوں کے مقابل کون کون کھڑا ہو رہا ہے؟

جی الانہ: ان میں سے ایک نشست جی ایم سید کی ہے۔

قائداعظم: جی ایم سید کی؟

جی الانہ: جی ہاں!

قائداعظم: یہ ایک انتہائی نازک انتخاب ہے لیگ کو مسلمانوں کی تمام نشستیں جیتنی چاہئیں۔ خاص طور پر سید کی نشست تو ہمیں بہر قیمت حاصل کرنی ہے آخر اس حلقہ میں ہماری کامیابی کی راہ میں کیا مشکلات ہیں؟

جی الانہ: جی ایم سید اپنے ضلع کے انتہائی بااثر شخص ہیں۔ وہ ضلع دادو کے پیر ہیں ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ہم نے ان کے مقابلے میں ضلع حیدرآباد کے قاضی اکبر کو کھڑا کیا ہے۔ جی ایم سید کے حامی اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں سے کہتے پھر رہے ہیں کہ قاضی محمد اکبر باہر کے آدمی ہیں۔

قائداعظم: میں جی ایم سید کی نشست کو انتہائی اہم سمجھتا ہوں۔ بہرصورت یہ نشست حاصل کرنا ہے۔ اس حلقہ میں لٹریچر کی بارش کر دو، ورکروں کی فوج بھیج دو، جلسے کرو اور قاضی اکبر کو ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں ہر قسم کی امداد دو۔

جی الانہ: بہت بہتر جناب!

قائداعظم: الانہ، تم اپنا ہیڈ کوارٹر کراچی سے حیدرآباد منتقل کر دو تاکہ جی ایم سید کے انتخابی حلقے سے قریب رہ سکو۔ میں بہت جلد کل ہند اہمیت کے چند لیڈر اور علی گڑھ سے طالب علم رضا کار بھیجوں گا۔

جی الانہ: شکریہ، خدا حافظ۔ (جی الانہ کمرہ سے باہر جانے کیلئے مڑتے ہیں تو قائداعظم دوبارہ طلب فرماتے ہیں)

قائداعظم: (اپنے قریب کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے) ایک بات یاد رکھیے۔ اگرچہ یہ انتخابات اہم ہیں، تاہم، اس میں جیتنے کیلئے نامناسب طریقے اختیار نہ کئے جائیں۔ مثال کے طور پر آپ کو جی ایم سید کے حلقے میں مسلم لیگ کے نمائندے قاضی اکبر کو بہر قیمت کامیاب کرانا ہے لیکن ووٹروں کو کسی قسم کی رشوت نہیں دی جائے گی۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کیلئے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔

اس واقعہ کے راوی جی الانہ لکھتے ہیں ''ان کا خیال تھا کہ قیام پاکستان جیسے اعلیٰ مقصد کے حصول کیلئے صرف اخلاقی طریقوں کو ہی بروئے کار لانا چاہیے۔''

☆☆☆☆☆

کرائے کے کارکن بھی نہیں

1937ء میں جب قائداعظم نے مسلم کی از سر نو تنظیم شروع کی اور اسے ایک تحریک کے طور پر

ملک کے طول وعرض میں پھیلانا شروع کیا تو ہر جگہ باشعور مسلمانوں نے ان کے ساتھ تعاون کیا لیکن شروع میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ منجھے ہوئے سیاسی کارکن جو اچھے مقرر ہوں اور عوام میں کام بھی کرسکیں، اور بھی کم تھے۔

یہی صورتحال 1937ء میں شملہ میں تھی۔ وہاں کے ایک دردمند مسلمان پیرزادہ محمد ذکاء اللہ نے مسلم لیگ کیلئے پرجوش طریقے سے کام شروع کیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ عوام میں سیاسی کام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مسلم لیگ کے ساتھ دو ایک عوامی مقرر بھی ہوں۔ چنانچہ ایک عرصہ کی کوشش کے بعد انہوں نے ایک مشہور کارکن کو جو بڑے مقرر بھی تھے، مسلم لیگ کیلئے تھوڑے سے معاوضے پر کام کرنے کیلئے راضی کرلیا۔ اور اپنے طور پر سمجھے کہ انہوں نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ کچھ اس کی داد لینے اور کچھ رسمی اجازت لینے کیلئے وہ قائداعظم کی خدمت میں باریاب ہوئے۔

پیرزادہ: ہمیں شملہ میں مسلم لیگ کی تحریک کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے ایک تجربہ کار سیاسی کارکن اور شعلہ بیان مقرر کی اشد ضرورت تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

قائداعظم: یہ تو اچھی خبر ہے۔

پیرزادہ: مگر اس کانگریسی مسلمان مقرر اور سیاسی کارکن کا ایک معمولی سا مطالبہ بھی ہے۔

قائداعظم: کیا؟

پیرزادہ: کہ لیگ اس کے گزارے کیلئے صرف سو روپیہ مہینہ کا انتظام کر دے۔ اگر ضروری ہوا تو ہم لوگ خود ہی اس رقم کا انتظام کرلیں گے۔ لیگ کے مرکزی فنڈ پر اس کا بار نہ ڈالیں گے۔ صرف آپ کی اجازت کی دیر ہے۔

قائداعظم: (قدرے ناخوشی کے ساتھ) مجھے افسوس ہے کہ میں تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ خواہ روپیہ کوئی دے۔

پیرزادہ: میں تو سمجھا تھا کہ میں ایک اہم خبر لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، اور آپ

میری تجویز کا خیر مقدم کریں گے۔ آخر ہمارے پاس کارکن ہیں ہی کتنے؟ اور ان میں سے بھی کتنے ایسے ہیں جو عام مسلمانوں پر اثر ڈال سکتے ہیں۔

قائداعظم: دیکھئے مسٹر پیرزادہ، میں اپ کی نیک نیتی سے پیش کی ہوئی تجویز کو اس لئے منظور نہیں کر سکتا کہ یہ کام مسلمانوں کا اپنا کام ہے، اور اسے کرنے کیلئے کسی مسلمان کو رشوت دینا میرے لئے قطعاً ناجائز ہے۔ اگر آپ کے دوست واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں مسلم لیگ میں آ کر کام کرنا چاہیے تو اس کے لئے شرطیں ٹھہرانا کیا معنی؟ دوسرے ہم ایک غریب قوم ہیں۔ آپ کے دوست ہم سے صرف ایک سو روپیہ مانگتے ہیں۔ اگر ہم ان کی شرط منظور کر بھی لیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قوم ہم سے زیادہ دام دے کر انہیں ہم سے دوبارہ چھین نہ لے گی۔ تم ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ اگر وہ آ کر ہم میں شامل ہو جائیں تو ہم دل و جان سے ان کا استقبال کریں گے۔ جو روکھی سوکھی، ہمیں میسر ہے اس میں ہمارے حصہ دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ کوئی پیشگی شرط منوانا چاہتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ جہاں ہیں وہیں رہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صاحب مسلم لیگ کا کام کرنے پر تیار نہیں ہوئے لیکن قائداعظم نے سیاسی رشوت دینے کی اجازت نہیں دی۔

☆☆☆☆☆

پھاٹک بند کر دو

جس زمانے میں قائداعظم گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں قیام پذیر تھے، کبھی کبھی سیر کیلئے ملیر تک جاتے تھے۔ کوئی خصوصی حفاظتی انتظام نہیں ہوتا تھا۔ صرف اے ڈی سی کیپٹن گل حسن ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک روز راستے کا پھاٹک بند تھا۔ چنانچہ قائداعظم کی گاڑی پھاٹک کے قریب جا کر رک گئی۔ یہ دیکھ کر اے ڈی سی گاڑی سے اترے اور پھاٹک والے سے کہا اگر گاڑی دور ہے تو پھاٹک کھول دو۔ کار میں قائداعظم بیٹھے ہیں۔ اس نے یہ کہہ کر کہ ٹرین تو ابھی دور ہے، پھاٹک کھول دیا، گل حسن آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے اور کار کے ڈرائیور عزیز کو اشارہ کیا کہ

آ گے چلو۔ عزیز نے کہا کہ صاحب کا حکم ہے کہ گاڑی نہیں چلے گی۔ اس لمحے قائداعظم نے اے ڈی سی گل حسن سے کہا۔

"گل اس آدمی سے کہو کہ پھاٹک بند کر دے۔"

گل حسن پھر اترے اور پھاٹک والے سے کہا کہ پھاٹک بند کر دو۔ اس نے کہا، صاحب کوئی حرج نہیں، گاڑی ابھی دور ہے۔ آپ کار نکال لے جائیں۔ اسکے جواب میں انہوں نے کہا، وہ ٹھیک ہے لیکن فی الحال تم فوراً پھاٹک بند کر دو، خیریت اسی میں ہے۔ اس نے ناچار اور حیران ہوکر پھاٹک بند کر دیا۔ جب کچھ دیر کے بعد ٹرین گزری، پھاٹک کھلا۔ تب کہیں جا کے قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل آف پاکستان کی سٹاف کار آگے بڑھی۔ تھوڑی دیر کے بعد قائداعظم اور کیپٹن گل حسن کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

قائداعظم: گل

گل حسن: سر

قائداعظم: گل، آپ کو معلوم ہے کہ میں نے پھاٹک بند کروانے کو کیوں کہا تھا۔

گل حسن: جناب، مجھے نہیں معلوم۔

قائداعظم: اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر میں اپنی ہدایات اور احکامات پر عمل نہ کروں جب کہ میں ملک کا سربراہ ہوں، تو پھر میں دوسروں سے توقع کیسے رکھ سکوں گا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کریں۔

قائداعظم کے اے ڈی سی 1972ء میں لیفٹیننٹ جنرل ہوکر چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ منیر احمد نے یہ واقعہ مئی 1980ء کے رسالہ آتش فشاں میں جنرل گل حسن کے انٹرویو میں نقل کیا۔

☆☆☆☆☆

میں ہرگز منافقت اختیار نہیں کروں گا

1937ء کی بات ہے شملہ میں قائداعظم کا شاندار جلوس لوئر مال سے گزر رہا تھا۔ جلوس میں قائداعظم کے ساتھ فاطمہ جناح، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، مولانا ظفر علی خان، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، سردار اورنگ زیب، سر سعداللہ خان، عبدالمتین چودھری، حاجی عبدالستار سیٹھ، ایم اے ایچ اصفہانی اور راجہ صاحب محمود آباد بھی تھے۔ قائداعظم ایک کھلی رکشہ میں تھے اور انہوں نے اپنا ہیٹ اپنے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک لیگی نے کہا۔

لیگی کارکن: جناب والا۔ آپ اپنا ہیٹ اٹھا کر اپنے پاؤں کے قریب رکھ لیجئے۔

قائداعظم: (قدرے چونک کر) کیوں؟

لیگی کارکن: عام مسلمان ہیٹ پسند نہیں کرتے، اگر آپ ہیٹ نیچے رکھیں گے تو وہ خوش ہوں گے۔

قائداعظم: میں کبھی بھی گاندھی کی طرح منافقت اختیار نہیں کروں گا۔

اس واقعہ کے عینی شاہد، انبالے کے مشہور مسلم لیگی راہ نما سید کاظم علی لکھتے ہیں کہ یہ کہہ کر قائداعظم نے اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔

☆☆☆☆☆

یہ تو اعتماد شکنی ہوئی

یہ واقعہ 1947ء کا ہے۔ قدرت اللہ شہاب آئی سی ایس ہندوستان کے صوبے اڑیسہ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری کے منصب پر فائز تھے۔ یہ محکمہ صوبہ کے چیف منسٹر شری ہری کرشن مہتاب کے چارج میں تھا۔ وہ قدرت اللہ شہاب پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اور اکثر اپنے سرکاری اور سیاسی کاغذات ان کے حوالے کر دیتے تھے۔

ہری کرشن مہتاب آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ایک بار وہ دہلی میں

کسی میٹنگ سے واپس آئے تو جو کاغذات انہوں نے قدرت اللہ شہاب کے حوالے کئے ان میں ایک انتہائی خفیہ مراسلہ بھی تھا جو کانگریسی ہائی کمان کی طرف سے کانگریسی چیف منسٹروں کے نام اس ہدات کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ ہر چیف منسٹر اپنی ذاتی تحویل میں رکھے۔ اس میں لکھا تھا کہ تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے اس لئے جن صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہیں وہاں پر مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے۔

ڈی سی، آئی جی اور ایس پی عموماً ہندو ہوں۔ تھانوں کے انچارج بھی زیادہ سے زیادہ ہندو ہوں محکمہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں مسلمانوں کو فیلڈ ورک سے ہٹا کر بے ضرر دفتری قسم کے کام کاج پر لگا دیا جائے۔ پولیس کی نفری میں مسلمان سپاہیوں کو بتدریج غیر مسلح کر کے پولیس لائن اور تھانوں میں معمولی فرائض پر مامور کیا جائے۔ جن صوبوں میں سرحدی مسلمانوں سے بھرتی شدہ گھڑ سوار ملٹری پولیس ہے، اسے فوراً توڑ دیا جائے۔ وغیرہ۔

ان ہدایات سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کے خلاف بڑے خطرناک منصوبے بنانے میں مصروف ہیں۔

چنانچہ قدرت اللہ شہاب نے وہ ستاویز جیب میں ڈالی۔ اور دہلی میں جا کر قائداعظم کی خدمت میں پیش کر دی۔

قائداعظم: (دستاویز پڑھ کر) یہ ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ تم نے یہ کہاں سے حاصل کی؟

قدرت اللہ شہاب: میں اڑیسہ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری ہوں۔ اس محکمہ کے سربراہ چیف منسٹر ہری کرشن مہتاب مجھ پر کافی اعتماد کرتے ہیں اور اکثر اپنے سیاسی کاغذات میری تحویل میں دے دیتے ہیں۔ یہ دستاویز انہوں نے میرے حوالے کی تھی۔

قائداعظم: خوب، ویسے تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ تو اعتماد شکنی ہوئی۔

قدرت اللہ شہاب: جناب فرائض منصبی اپنی جگہ، میں نے تو اپنا قومی فرض پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

قائداعظم: تم دیکھتے نہیں کہ ہر کاپی پر نمبر لگا ہوا ہے۔ اس کی گمشدگی کا آسانی سے پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ کیا تم اس کے نتائج بھگتنے کو تیار ہو؟

قدرت اللہ شہاب: جی جناب، میں پوری طرح تیار ہوں۔

قائداعظم: (دستاویز اپنے پاس رکھتے ہوئے) آل رائٹ اب تم جاسکتے ہو۔

جب قدرت اللہ شہاب واپس مڑ کر دروازے کے قریب پہنچے تو قائداعظم نے بلند آواز سے پکار کر کہا: ''نوجوان آئندہ ایسا نہ کرنا''۔

☆☆☆☆☆

حدیث کی کتاب اور فوٹو

شملہ کانفرنس کے بعد قائداعظم جب کوئٹہ تشریف لائے تو ریلوے سٹیشن پر یحییٰ بختیار نے ان کی چند تصویریں اتاریں۔ قائداعظم نے ان تصویروں کو پسند کیا اور اپنے سیکرٹری کے ایچ خورشید کو بلا کر کہا کہ ان تصویروں کو ڈان میں چھپوا دیں اور پھر یحییٰ بختیار سے فرمائش کی کہ آپ اتوار کو آ کر میری دو ایک تصویریں اتاریں تا کہ آٹوگراف دینے کے کام آئیں۔ دوسرے روز مقررہ وقت پر یحییٰ بختیار فوٹوگرافی کا ضروری سامان لے کر قائداعظم کی قیام گاہ خان آف قلات کے ڈیرے پر پہنچے۔ قائداعظم اس وقت سیاہ شیروانی میں ملبوس صوفے پر بیٹھے تھے۔ یحییٰ بختیار جب اپنے کیمرے کو سیٹ کر رہے تھے تو ان کی نگاہ قائداعظم کے سامنے میز پر رکھی ہوئی ایک کتاب پر پڑی جس کے سرورق پر انگریزی میں ''الحدیث'' لکھا تھا۔ ایک دم انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

یحییٰ بختیار: سر، آپ یہ کتاب ہاتھ میں اٹھالیں تا کہ میں تصویر لے لوں۔

قائداعظم: نہیں، یوں نہیں۔

یحییٰ بختیار لکھتے ہیں کہ پھر انہوں نے ساتھ کے بک ریک میں سے مسلم لیگ کا آئین اٹھایا۔ اس کے بعد ڈان اخبار پکڑا اور فرمایا ''یہ ٹھیک ہے۔''

☆☆☆☆☆

تقوے کی منزل

موت سے کسے مفر ہے۔ بیماری نہ عالم کو دیکھتی ہے نہ کسی کے علمی یا دینی مرتبے کو خاطر میں لاتی ہے۔ ایک بڑے دینی مدرسہ مظاہرۃ العلوم سہارنپور کے ایک بہت بڑے مدرس تھے۔ دو چار نہیں پورے بتیس برس وہاں درس دے رہے تھے۔ اور درس بھی کسی اور چیز کا نہیں، حدیث کا۔ گویا محدث تھے اور بڑے پائے کے محدث۔ معمر تو تھے ہی، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک روز یکا یک بیماری نے آ لیا۔ زندگی میں نماز تو خیر کیا قضا کرتے درس بھی بے وجہ کبھی نہ قضا کیا تھا۔ اب جو بستر سے لگے تو مدرسہ سے رخصت لینا پڑی۔ بیماری نے طول کھینچا۔ یہاں تک کہ کم و بیش پورا ماہ دوا علاج میں گزر گیا لیکن جب مہینے کی شروع تاریخوں میں مدرسہ کا ہرکارہ تنخواہ لے کر آیا تو یہ گفتگو ہوئی:

ہرکارہ: ناظم صاحب نے یہ تنخواہ کی رقم بھیجی ہے۔

مولانا: انہیں میرا اسلام کہنا اور یہ روپے واپس کر دینا۔

ہرکارہ: لیکن کیوں؟ کیا حساب میں کوئی غلطی ہوگئی ہے؟

مولانا: نہیں۔

ہرکارہ: پھر مجھ سے کچھ فروگزاشت ہوئی؟

مولانا: نہیں، یہ بات بھی نہیں۔

ہرکارہ: تو پھر آپ اپنی تنخواہ کیوں نہیں لیتے؟

مولانا: دیکھو میاں، تنخواہ تو کام کی ہوتی ہے۔ میں تو گزشتہ مہینے بیماری کی وجہ سے مدرسہ جا ہی نہیں سکا۔ تو پھر تنخواہ کس بات کی لوں؟

ہرکارہ: حضرت، آپ تکلف کر رہے ہیں۔ بیماری کی وجہ سے چھٹی لینا ہر ادارے کے کارکن کا بنیادی حق ہوتا ہے۔ ضابطے کی رو سے اسے چھٹی کے زمانے کی پوری تنخواہ ملتی ہے۔ اسی ضابطہ کے مطابق آپ کی خدمت میں تنخواہ پیش کی گئی ہے۔

حضرت، آپ مدرسہ کے ملازم نہیں خود مدرسہ ہیں۔ آپ ہی کے دم قدم سے یہاں روشنی ہے۔ آپ نے برسہا برس اس مدرسے کی خدمت کی ہے۔ اب اگر ساری عمر آپ کی خدمت کی جائے تب بھی آپ کی عظیم خدمات کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

مولانا: میرے بھائی، بات ضابطے کی نہیں، احساس کی ہے۔ میرا دل اس معاوضے کو قبول کرنے کو آمادہ نہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کر چکے۔ اب جو میں نے آپ سے کہا وہ کیجئے۔

اس طرح مولانا نے چھٹی کے دنوں کی تنخواہ نہیں لی۔ بات مہتمم تک پہنچی۔ انہیں بھی تشویش ہوئی۔ خاص طور پر اس لئے کہ انہیں معلوم تھا کہ مولانا کے مالی حالات اچھے نہیں۔ بیماری پر بھی روپیہ خرچ ہو رہا تھا۔ روپے کی انہیں یقیناً ضرورت تھی۔ ایک بار پھر کوشش کی گئی کہ مولانا تنخواہ وصول کر لیں لیکن انہوں نے پھر وہی جواب دیا۔ ''اس پیسے کو اپنے لئے جائز نہیں سمجھتا۔'' اس بحث میں خاصا وقت گزر گیا۔ آخر کار مدرسہ کی مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ مدرسہ کے مہتمم صاحب خود جا کر مولانا کو یہ رقم پیش کریں۔ وہ ابھی اس انتظار میں تھے کہ مولانا کی طبیعت ذرا سنبھلے تو جائیں کہ مولانا اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ان کی وفات کے بعد مہتمم صاحب نے بہ نفس نفیس یہ رقم مولانا کی بیوہ کی خدمت میں پیش کی اور کہا۔ ''یہ مولانا مرحوم کا حق تھا۔ اب گویا ایک امانت ہم آپ کو پیش کر رہے ہیں جس کی آپ جائز وارث ہیں۔''

یہ سن کر عالی ظرف خاتون نے جو جواب دیا، وہ یہ تھا۔

''جو روپیہ مرحوم نے اپنی زندگی میں خود قبول نہ کیا وہ ان کے بعد کیسے لے لوں؟''

فرض کی ادائیگی کا معاوضہ

یہ واقعہ علی گڑھ کا ہے۔ 1926ء کے سرما میں جس دن دستور ساز اسمبلی کے انتخاب ہو رہے

تھے مسلم لیگ کے ایک کارکن اچھو میاں، مسلم لیگ کیلئے یومیہ اجرت پر لئے ہوئے تانگہ پر رائے دہندگان کو تلاش کر رہے تھے۔ یونیورسٹی کی ایک سڑک پر شعبہ معاشیات کے صدر ڈاکٹر ایل کے حیدر کو پیدل جاتے دیکھا تو تانگہ روکا۔

اچھو میاں: ڈاکٹر صاحب، تشریف رکھیئے۔ یہ مسلم لیگ کا تانگہ ہے۔

ڈاکٹر حیدر: شکریہ۔ اس مقصد کے لئے تانگے میں نہ بیٹھوں گا۔

اچھو میاں: ڈاکٹر صاحب، یہ تانگہ ووٹروں کو لانے لے جانے ہی کیلئے ہے۔

ڈاکٹر حیدر: رائے دہندگی کا حق میں اپنی خوشی سے استعمال کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ سے کسی قسم کی آسائش حاصل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے فرض کی ادائیگی کا معاوضہ وصول کیا۔ اور اپنے آپ کو فروخت کر دیا۔

ڈاکٹر حیدر نے یہ جملہ ختم کیا اور پولنگ سٹیشن کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیئے۔

☆☆☆☆☆

مٹھی بھر آٹا

ایک بزرگ تھے مولوی عبداللہ نام کے۔ گھر سے باہر نکلتے تو دو مٹھی آٹا، ایک ڈلی نمک کی رومال میں باندھ کے نکلتے۔ جب کھانے کا وقت ہو جاتا تو اپنے آٹے کی روٹی پکا کر نمک کی ڈلی یا پیاز کی گنٹھی سے کھا لیتے۔ لوگ باگ پوچھتے۔

مولوی صاحب: یہ کیا۔ کیا آپ کو ہمارا کھانا پسند نہیں؟

مولوی صاحب: یہ بات نہیں۔

لوگ: تو پھر آپ ہمارے ساتھ کھاتے کیوں نہیں؟

مولوی صاحب: بس یہ نہ پوچھو۔ یہ ایک مجبوری ہے۔

لوگ: کوئی تکلیف ہے؟

مولوی صاحب: نہیں الحمداللہ۔ اچھا ہوں۔

لوگ: تو پھر کیا بات ہے۔ آج آپ کو بتانا پڑے گا۔

مولوی صاحب: دیکھو بچو، لالٹین میں صاف تیل کیوں ڈالتے ہو؟

لوگ: صاف روشنی کیلئے۔

مولوی صاحب: تو اب سمجھ گئے، میں باہر اپنی محنت کا مٹھی بھر آٹا کیوں لے جاتا ہوں۔ میرا آنا ہر طرح کے لوگوں میں ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ کس کا رزق حلال ہے اور کس کا نہیں۔ دیکھو پھل میں کیڑے ہوں تو بدن کو نقصان دیتے ہیں۔ اگر رزق حلال نہ ہوگا تو کیا روح کو نقصان نہ ہوگا؟

☆☆☆☆☆

باپ کی عاقبت سنوارنے کی تدبیر

باپ کے قل سے فارغ ہو کر بیٹے نے روپوں کی تھیلی کمر سے باندھی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ لوگوں نے پوچھا ''مولوی جی کہاں چلے؟''

جواب دیا ''باپ کی عاقبت سنوارنے۔''

پہلا گاؤں بیس پچیس کوس کی مسافت پر تھا۔ وہاں پہنچے تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مقدور بھر تواضع کی اور اصرار کیا کہ آج جمعہ آپ ہی پڑھائیں، یہ راضی ہو گئے نماز کے بعد منبر پر کھڑے ہو کے بولے۔

''آپ لوگوں نے والد صاحب کے انتقال پر اتنا اظہارِ افسوس کیا ہے۔ اب ان کا بوجھ بھی اتاریئے۔''

حاضرین: وہ کیسے مولوی صاحب؟

مولوی صاحب: آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ حقوق العباد میں کوتاہی معاف نہیں ہوتی۔

حاضرین: جی ہاں یہ بات خود بڑے مولوی صاحب اکثر بتایا کرتے تھے۔

مولوی صاحب: والد صاحب کا یہاں آنا جانا تھا۔ لین دین بھی ہوتا ہوگا۔ شاید انہوں نے کبھی کسی سے روپیہ پیسہ بھی قرض لیا ہو۔

حاضرین: ہمیں تو یاد نہیں۔

مولوی صاحب: پھر بھی، کبھی بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ براہ مہربانی آپ حافظہ پر زور دیں، اگر کسی کا کچھ پیسہ ان کے ذمے نکلتا ہو تو ضرور مجھے بتائیں۔ اور مجھ سے ابھی لے لیں۔ میں صاحبِ نصاب ہوں۔ میرے پاس اللہ کے کرم سے اتنا پیسہ ہے کہ میں والد مرحوم کا چھوٹا بڑا قرض ادا کرسکوں۔

اس طرح یہ صاحب آس پاس کے سارے علاقے میں گھومے پھرے۔ جہاں جہاں ان کے والد مرحوم آیا کرتے تھے، وہاں گئے۔ جن جن لوگوں سے ان کے تعلقات تھے ان سے فرداً فرداً ملے۔ اور ہر ایک سے یہی پوچھا۔

''والد صاحب کے ذمے آپ کی کوئی چیز، کوئی پیسہ تو نہیں؟''

لوگ کہتے۔

''مولوی جی، آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ روپیہ کونسی بڑی چیز ہے۔ وہ ہمارے بزرگ تھے۔ اگر ان کے ذمے کچھ تھا بھی تو ہم نے معاف کیا۔''

ان کا جواب ہوتا۔

''نہیں، معاف کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ ان کی زمینیں ہی میرے حصے میں نہیں آئیں، ان کے لین دین بھی میرے حصے میں آتے ہیں۔ ان کے ذمے جو قرض تھا وہ میں خوشی سے ادا کروں گا۔ لیکن اگر کسی کے ذمے ان کا ایک پیسہ بھی ہے تو وہ مجھے ادا کرے۔ میں وہ پیسہ بھی لے لوں گا۔''

یہ گھر گھر جا کر باپ کا امکانی قرض چکانے والے ضلع گجرات کے مولوی عبداللہ تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

رزق حلال کے طالب فقیر کا قصہ

ہمارے ایک شناسا کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ حلال وحرام پر ان کی نظر رہتی ہے۔ ان کے ایک بیٹے فوج میں کرنل ڈاکٹر ہیں۔ جب یہ کرنل ڈاکٹر گھر چھٹی پر آئے تو دیکھا کہ دوپہر ہوئی تو وہ بوڑھا فقیر جو اکثر دروازے پر نظر آتا تھا آج بھی موجود ہے۔ اور بار بار دروازے پر دستک دیتا ہے اور کہتا جاتا ہے "جلدی کرو، کھانے کا وقت ہو گیا۔"

جب دوسری تیسری بار اس نے دروازے پر لکڑی کا ٹھوکا دیا اور سختی سے کہا "آج کیا بات ہے، ہمارا کھانا کیوں نہیں آتا۔" تو کرنل صاحب کو سخت تعجب ہوا۔ اور غصہ بھی آیا کہ فقیر ہے اور رعب ڈالتا ہے۔ وہ اٹھے کہ اسے تنبیہہ کریں تو ان کی والدہ محترمہ نے روک دیا اور کہا کہ یہ عام فقیر نہیں۔ یہ ہمارا مہمان ہے۔ اسے تم کچھ نہ کہنا۔ اس کا حق ہمارے رزق پر ہے بہر حال جب کھانا تیار ہوا تو والدہ نے ان سے کہا، اب تم خود جا کر بابا کو کھانا دو۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ برآمدے پر مونڈھا پڑا تھا۔ سامنے تپائی تھی۔ اس پر ٹرے رکھی۔ اور بابا سے تاخیر کی معذرت کی، اس کی تاکید بھی ان کی والدہ نے کی تھی۔ کھانے کے بعد کرنل ڈاکٹر اور بارعب چہرے والے فقیر بابا میں یہ گفتگو ہوئی۔

کرنل: بابا، آپ کس علاقے کے ہیں؟

بابا: علاقہ کیا؟ سارا علاقہ اپنا علاقہ ہے۔

کرنل: پھر بھی، آبائی وطن کون سا ہے؟

بابا: کبھی سرحد پار رہتا تھا۔ اب تو برس ہا برس سے ان ہی میدانوں میں پھر رہا ہوں۔

کرنل: یہاں کہاں رہتے ہیں؟

بابا: یہاں سے پانچ سات میل کے فاصلہ پر دریا کنارے جھونپڑا ہے۔

کرنل: سات میل دور؟

بابا: ہاں بابا۔ پیٹ بری بلا ہے۔ وہیں سے روٹی کھانے آتا ہوں۔

کرنل: صرف یہاں روٹی کھانے؟

بابا: بیٹا بھیک مانگنا میری عادت نہیں۔ ایک وقت کی روٹی چاہیے۔ وہ اس گھر سے کھاتا ہوں۔

کرنل: کیا مطلب؟ ایک وقت کی روٹی اور وہ بھی صرف یہاں سے؟

بابا: ہاں بیٹا میرے لئے یہی بہت ہے۔ ایک وقت کی روٹی سے کام چل جاتا ہے۔ وہی لیتا ہوں۔ اس سے زیادہ ایک لقمہ نہیں چاہیے۔

کرنل: لیکن بابا، پیٹ بھرنے کیلئے ایک وقت کی روٹی تو آپ کو اس شہر میں کہیں بھی مل سکتی ہے۔

بابا: بیٹا، تجھے اتنی باتیں پوچھنے کی کیا پڑی ہے؟ تو کون ہے؟ کیا اس مائی کا بڑا بیٹا ہے؟

کرنل: ہاں، بابا جی۔

بابا: پھر یہ لڑکا کون ہے جو روز مجھے اندر سے کھانا لا کے دیتا ہے؟

کرنل: یہ میرا بھانجا ہے۔

بابا: اللہ اس گھر سے راضی ہو۔ یہ اچھا بچہ ہے۔

کرنل: لیکن بابا جی، آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

بابا: کون سا سوال؟

کرنل: یہی کہ آپ ایک وقت کے کھانے کیلئے سات میل دور سے چل کے یہاں کیوں آتے ہیں؟

بابا: بچے، تو بھی بڑا کھوجی ہے۔ یہ کیوں پوچھتا ہے؟

کرنل: بس، جاننا چاہتا ہوں۔

بابا: بچے، کھانے کو روٹی تو کہیں سے بھی مل سکتی ہے۔ لیکن اس گھر سے مجھے رزق حلال ملتا ہے۔

کرنل: (حیرت سے) رزق حلال؟

بابا: ہاں بیٹا، رزق حلال۔ اللہ اس گھر سے راضی ہو۔ اب ہم چلے۔ اب ایک بات تم بتاؤ۔

کرنل: کیا؟

بابا: تمہاری بہن کے کتنے بیٹے ہیں؟

کرنل: صرف یہی ایک ہے۔

بابا: اللہ نے چاہا تو سات بیٹے پورے ہوں گے، سات۔

بابا نے یہ کہا اور اپنا عصا اٹھا کر چل کھڑا ہوا۔ کرنل صاحب کہتے ہیں، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کہ بہن کے ہاں چھ بیٹے اور ہوئے۔

☆☆☆☆☆

اطاعتِ امیر کے حکم کی ایک نئی تعبیر

ایک استاد جن کا شمار مدرسہ کے جید اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ دارالعلوم سے باہر کہیں سفر پر چلے، چند طلباء بھی ساتھ تھے۔

مولانا: سفر میں کسی کو امیر بنانے کا حکم ہے۔ بہتر ہے ہم سے کسی کو امیر بنا لیا جائے۔

طلباء: حضرت استاد بھی آپ، بزرگ بھی آپ اور ہم سب سے زیادہ تجربہ کار بھی آپ، لہٰذا امیر بھی آپ ہوئے۔

مولانا: مجھے یہ انتخاب منظور ہے۔ لیکن جب آپ مجھے امیر بناتے ہیں تو امیر کی اطاعت بھی کرنا ہوگی۔

طلبا: انشاء اللہ ضرور، اطاعت اور وہ بھی آپ کی؟ ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔

مولانا: اب جو سفر شروع ہوا تو مولانا نے اپنا اور ساتھیوں کا سامان خود اٹھا لیا۔

طلباء: حضرت، یہ کیا؟

مولانا: یہ سامان میں خود اٹھاؤں گا۔

طلباء: جناب یہ ہمارا حق ہے۔

مولانا: لیکن یہ میرا اختیار ہے۔ امیر میں ہوں، میرا اختیار مقدم ہے۔ آپ اطاعت امیر کیجئے۔

اس طرح سفر کے ہر مرحلے میں مشقت کا کام مولانا نے خود کیا۔ شاگرد شرمندہ ہو کر کچھ کہتے تو یہ اطاعت امیر کا فریضہ یاد دلاتے۔

☆☆☆☆☆

تانگے کے دو آنے

کبھی جالندھر میں مسلمان بچوں کی تعلیم اور تربیت کیلئے سکول ہوتا تھا تبلیغ اسلام۔ اس کے کرتا دھرتا وہاں کے معروف سیاسی اور سماجی کارکن ڈاکٹر مرزا حمید اللہ بیگ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب وہ جہلم میں آ کر آباد ہوئے اور کچھ پاؤں جمے تو انہیں پرانے سلسلے یاد آئے۔ جہلم میں سکولوں کی کمی تھی۔ سوچا کیوں نہ پہلے ایک سکول کھولا جائے۔ اس بات کا خیال آنا تھا کہ دوڑ دھوپ شروع کر دی اور تھوڑے دنوں میں دریا کے کنارے ایک متروکہ عمارت میں ایک سکول کی داغ بیل ڈال دی۔ نام وہی تبلیغ اسلام رکھا۔ خلوص سے کوئی کام بھی کیا جائے اللہ اس میں برکت دیتا ہے۔ چنانچہ اسکول چل نکلا لیکن عمارت ناکافی تھی۔ کلاسیں تو خیر کھلے میدان میں پیڑوں کے سائے تلے ہو جاتی تھیں لیکن سائنس کے عملی تجربات کیلئے ایک لیبارٹری ضروری تھی اور لیبارٹری کیلئے کم از کم دو کمرے۔ وسائل کی کمی کے باوجود مرزا حمید اللہ بیگ نے اللہ کا نام لے کر دو کمروں

کی بنیادیں کھدوادیں اور تعمیر کا کام شروع کروادیا۔ صبح وشام جب موقع ملتا مطب سے اٹھ کر سکول کا چکر لگا آتے اور اکثر پیدل جاتے۔ انہیں اس طرح پیدل آتے جاتے دیکھ کر اکثر لوگوں کو تعجب سا ہوتا تھا۔ ایک روز ان کے ایک عقیدت مند نوجوان صغیر شمسی نے ان سے پوچھ لیا۔

صغیر شمسی: ڈاکٹر صاحب، اجازت ہو تو ایک بات کہوں؟

ڈاکٹر حمید اللہ: ہاں، کیوں نہیں۔

صغیر شمسی: آپ کا سکول پیدل آنا جانا عجیب سے لگتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ: عجیب کیوں؟

صغیر شمسی: آپ کے مطب سے سکول تک تانگے کا کرایہ دو آنے ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ: وہ تو ہے، پھر؟

صغیر شمسی: دو آنے آپ کے لئے کیا حیثیت ہے۔ جہاں سکول کیلئے آپ اتنا کچھ کرتے ہیں بلکہ اس کا سارا بوجھ آپ اور آپ کے بیٹے اٹھاتے ہیں، وہاں دو چار آنے اپنے آرام پر خرچ کرنے سے کیا فرق پڑے گا؟

ڈاکٹر حمید اللہ: برخوردار، فرق پڑے گا اور بہت پڑے گا۔ دو آنے سے سکول کیلئے دو کیلیں ہی آ جائیں گی۔ یہ کچھ کم ہے؟

☆☆☆☆☆

بس ہو چکی نوکری

تقسیم سے پہلے مراد آباد میں ایک خاندانی آدمی تھے۔ نام بشیر الدین تھا اور پیشہ کے اعتبار سے نقشہ نویس تھے۔ ریاست رامپور میں اچھی خاصی ملازمت تھی۔ کسی بات پر ملازمت چھوڑ دی اور گھر آ بیٹھے۔ بیکاری بری بلا ہے۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے تب کہیں جا کے دوسری نوکری ملی، وہ بھی گوالیار میں۔ جگہ دور تھی ریاست بھی راجپوت ہندو راجہ کی۔ لیکن چونکہ تنخواہ بہت اچھی تھی اس

لئے بشیرالدین خان خوشی خوشی گوالیار روانہ ہو گئے۔ منزل مقصود پر پہنچ کر تانگہ لیا اور اپنے دفتر کی راہ لی۔ راستہ میں دیکھا کہ ایک جگہ مکانات گرائے جا رہے ہیں۔ بیسیوں مزدور لگے ہیں اور جگہ کو ہموار کیا جا رہا ہے۔ چونکہ ان کا کام تعمیرات ہی سے متعلق تھا، انہیں تجسس ہوا کہ یہ کیا ہو رہا ہے چنانچہ انہوں نے تانگے والے سے پوچھا۔

میاں تانگہ والے یہ کیا ہو رہا ہے۔ کوئی نئی عمارت بنے گی؟

کوچوان: آپ کو خبر نہیں، شاید یہاں نئے ہیں۔

بشیرالدین: ہاں بھائی نیا ہوں۔ بلکہ بالکل نیا ہوں۔ یہاں نوکری کرنے آیا ہوں۔

کوچوان: مہاراجہ نے اعلان کیا ہے وہ یہاں ایک مندر بنوائے گا اپنے باپ سورگ باشی کی یاد میں۔

بشیرالدین: مندر؟

کوچوان: ہاں۔ بڑا زبردست مندر بنے گا۔ بھگوان مہاراجہ کو خوش رکھے بڑا دیالو ہے۔

بشیرالدین: یہ سرکاری مندر ہو گا؟

کوچوان: ہاں جی۔ سرکار مہاراجہ کی، مندر مہاراجہ کا۔ سرکاری نہ ہوا تو کیا ہوا؟

بشیرالدین: (کچھ سوچ کر) میاں تانگے والے، واپس سٹیشن چلو۔

کوچوان: کیوں جی؟ کچھ سامان رہ گیا ہے سٹیشن پر؟

بشیرالدین: نہیں، سامان کی بات نہیں۔

کوچوان: آپ کا دفتر یہ سامنے رہا۔ میں ابھی پہنچاتا ہوں۔ آپ کے بات کرنے سے میں نے تانگہ آہستہ کر لیا تھا۔

بشیرالدین: نہیں مجھے اب دفتر نہیں جانا۔

کوچوان: نوکری نہیں کرنی؟

بشیرالدین: بس ہوچکی نوکری۔ تم تانگہ موڑو۔ واپس سٹیشن چلو۔

چنانچہ بشیرالدین خان الٹے پاؤں لوٹ آئے۔ سب کو حیرت ہوئی کہ ایسی کیا بات ہوئی۔ بیوی نے پوچھا تو کہا۔

''وہاں مندر بن رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے سب سے پہلے مندر کا نقشہ بنانا پڑے گا۔ ایسی نوکری کس کام کی؟''

☆☆☆☆☆

اس دفینہ کو ہاتھ نہ لگانا

جیسا گل ویسی بو۔ ان بشیرالدین خان کے والد تقوے میں ان سے بھی بڑھ کر تھے۔ انہوں نے کسی ہندو سے ایک مکان خریدا۔ مکان میں اس کے بزرگوں نے کسی جگہ کچھ سونا چاندی رکھ دیا تھا۔ بیچتے وقت اسے اس کی خبر نہیں تھی بعد میں اس کو گھر کے بزرگوں نے بتایا۔ یہ تم نے کیا کیا۔ سارا خزانہ کوڑی کے مول دے دیا۔ شدہ شدہ یہ بات بشیرالدین خان کے والد تک پہنچی۔ انہوں نے سابق مالک مکان کو بلایا۔ لالہ جی۔ معاف کیجئے میں نے آپ کو تکلیف دی۔

لالہ: خیریت تو ہے۔ خان صاحب ہمارا آپ کا حساب تو بیباق ہے۔

خان صاحب: نہیں، مجھے آپ کا کچھ دینا ہے۔

لالہ: کیا؟

خان صاحب: آپ کی امانت آپ کے سپرد کرنی ہے۔

لالہ: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

خان صاحب: مطلب یہ کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس مکان میں آپ کے بزرگوں کا کوئی خزانہ

دفن ہے۔

لالہ: ہاں، خبر تو ٹھیک ہے۔

خان صاحب: لالہ جی۔ تو پھر اس کو نکال لے جائیے۔

لالہ: کیوں؟

خان صاحب: میں نے آپ سے مکان خریدا ہے، دفینہ نہیں۔

لالہ: خان صاحب، مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔

خان صاحب: اب تو معلوم ہو گیا۔

لالہ: لیکن یہ میرا حق نہیں۔ میں مکان بیچ چکا ہوں۔ اس میں جو کچھ ہے وہ آپ کا ہے۔ مجھ پر بھگوان کی بڑی کرپا ہے۔ میں سونے چاندی کے ایک ڈھیر کی خاطر اپنا دھرم بھرشٹ نہ کروں گا۔

خان صاحب: تو پھر میں ایمان خراب کروں؟............ لالہ جی یہ نہیں ہو سکتا۔

اور خان صاحب نے دفینہ کو ہاتھ نہ لگایا۔ مرتے مرتے اولاد کو وصیت کر گئے کہ اس دفینہ کو ہاتھ نہ لگانا، یہ ہمارا حق نہیں۔

☆☆☆☆☆

فقیر اور فرنگی

کوئی سوسوا سو سال ادھر کی بات ہے۔ دہلی کی جامع مسجد کی سیر کیلئے کوئی انگریز آیا۔ مسجد کی سیڑھیوں پر فقیر بھی بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت بھی بیٹھے تھے۔ انگریز پاس سے گزرا تو ایک خستہ حال فقیر نے ہاتھ پھیلا دیا۔ انگریز نے جیب سے بٹوا نکال کر اسے کچھ دیا۔ لیکن جب بٹوا جیب میں رکھنے لگا تو بے خیالی میں بٹوا نیچے گر پڑا اور وہ آگے بڑھ گیا۔ فقیر نے دیکھا کہ بٹوا سامنے پڑا ہے تو جھٹ اٹھا لیا اور گدڑی میں چھپا لیا۔ فرصت میں اسے کھول کے دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی

رہ گئیں۔ بٹوا چمکتی ہوئی اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا۔ قلاش فقیر کچھ دیر تو اشرفیوں کو شوق اور حرص سے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بٹوے کو گدڑی میں دبا کر رکھ دیا دوسرے تیسرے روز وہ انگریز پھر آیا۔ فقیر نے اسے پہچان کر اس سے کہا! صاحب، اس دن آپ کو بٹوا گر گیا یہ لیتے جایئے۔

انگریز: اس میں اتنی اشرفیاں تھیں تمہاری نیت نہیں بگڑی؟

فقیر: بگڑی تو تھی مگر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔

انگریز: کیوں؟

فقیر: مجھے خیال آیا حشر کے دن حضرت عیسیٰ علیہ سلام کے سامنے میرے مولا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن جھک جائے گی کہ ان کے ایک امتی نے ایک عیسائی کی اشرفیاں ہتھیا لیں۔

یہ سن کر انگریز نے مسلمان فقیر کو دو اشرفیاں بطور انعام پیش کیں، فقیر نے انہیں بھی لینے سے انکار کر دیا اور کہا

”جناب یہ بھی وہی بات ہے۔ میں بھوکا مر سکتا ہوں لیکن اپنے مولا کو سبک نہیں کر سکتا۔“

☆☆☆☆☆

پراٹھے کے بدلے سوکھی روٹی

ایمان کی بہت سے نشانیاں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے سے کم خوش نصیب انسانوں سے کیسے پیش آتا ہے۔ ان کی کتنی دلداری کرتا ہے اور ان کی خودداری کا کتنا لحاظ کرتا ہے۔

لاہور سے کراچی تک ریل کا سفر لمبا سفر ہے۔ اس لئے مسافر حسب استطاعت کھانے پینے کا کچھ سامان ساتھ لے لیتے ہیں۔ جب شام پڑی اور ڈبوں کی بتیاں جلیں تو تھوڑی دیر بعد مسافروں نے اپنا اپنا زاد راہ نکالا۔ زاد راہ تو بڑے لوگوں کا ہوتا ہے تیسرے درجے کے ان تنگدست وخستہ حال بیشتر مسافروں کے پاس ناشتہ دان قسم کی کوئی شاندار چیز نہ تھی۔ کسی نے رومال میں کچھ باندھا ہوا تھا کسی نے پرانے اخبار میں کچھ لپیٹا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک کونے میں بیٹھے مزدور قسم کے ایک

آدمی نے اپنی پوٹلی کھولی۔ اس میں دو چار روٹیاں تھیں اور پیاز کی ایک گنٹھی۔ ساتھ جو شہری مسافر بیٹھا تھا، بھوک تو اسے بھی لگی تھی۔ اس نے اپنی کتاب بند کی اور چاہا کہ اپنی ٹوکری میں سے اپنا سامان نکالے۔ اس کے پاس گندم کے آٹے کی روغنی روٹیاں تھیں اور آلو کا بھرتا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ میرا کھانا اس ساتھی سے بہتر ہے۔ میں اس کے سامنے کھاؤں گا تو اس کا دل میلا ہوگا۔ اس لئے بھوک کے باوجود چپ رہا اور اپنا کھانا نہ نکالا۔ پھر دونوں میں یہ باتیں ہوئیں۔

پہلا مسافر: لو بھائی بسم اللہ، کھانا کھاؤ۔

دوسرا مسافر: شکریہ، مجھے کھانا نہیں کھانا۔

پہلا مسافر: کیوں؟ کیا کچھ تکلیف ہے؟

دوسرا مسافر: نہیں، تکلیف تو کوئی خاص نہیں۔ کھانا بھی میرے پاس ہے لیکن میری پسند کا نہیں۔

پہلا مسافر: تو پھر تمہیں چنے کی یہ روٹیاں کیا پسند آئیں گی؟

دوسرا مسافر: دراصل جب میں لاہور سے چلا تو میرے دوست نے شوق میں آ کر روغنی روٹی اور آلو کا بھرتا میرے ساتھ کر دیا اور میرا پیٹ کچھ ٹھیک نہیں۔ پراٹھوں سے بہتر تو تمہاری روٹی ہے۔

پہلا مسافر: اگر تم یہ سوکھی روٹی کھانا پسند کرو تو شوق سے کھالو۔ (ہنس کر) مجھے تمہارے پراٹھے آلو سے انکار نہیں۔

اس طرح دوسرے مسافر نے اپنے پراٹھے آلو نکالے۔ ساتھ کچھ اچار بھی تھا اور پہلے مسافر نے بڑے شوق سے آلو پراٹھے کھائے۔ دوسرے نے اسی رغبت سے چنے کی خشک روٹی پیاز سے کھائی۔ تیسرے مسافر نے اپنی صراحی سے پانی پیش کیا۔ اس طرح ان مسافروں کا کھانا ختم ہوا۔

لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ دوسرے مسافر کو اپنا بہتر کھانا نکالتے وقت جو جھجک محسوس ہوئی۔ اپنے سے غریب تر مسافر کے احساس خودی کو مجروح نہ کرنے کا جو خیال اس کے دل میں

پیدا ہوا اسی کا نام تقویٰ ہے۔ یہی طرزِ احساس اسلامی معاشرہ کی جان ہے۔ اقبال نے کہا ہے ۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

یہ دلداری اور دل نوازی ہر مسلمان کی انمول میراث ہے۔ اس دوسرے مسافر کا نام احسان دانش تھا۔ یہ واقعہ احسان دانش کی تصنیف ''جہان دانش'' کے صفحہ 348 پر درج ہے۔

☆☆☆☆☆

مسلمان ہوں اس لئے دیانتدار ہوں

''من الظلمات اِلی النور'' کے مصنف پرنسپل غازی احمد نے مارچ 1938ء میں عالم خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی۔ اسلام قبول کرنے سے قبل ان کا نام کرشن لال تھا۔ 1947ء میں پاکستان بننے پر ان کے ہندو اعزاء بوچھال کلاں ضلع جہلم کے دوسرے ہندوؤں کے ساتھ چکوال کیمپ میں منتقل ہو گئے تاکہ وہاں سے سپیشل ٹرین کے ذریعہ ہندوستان جا سکیں۔ کیمپ منتقل ہونے سے قبل غازی احمد کی خالہ نے ایک بوری میں کچھ سامان رکھا، امانت کے طور ان کے سپرد کیا اور کہا ''اگر کیمپ میں زندہ بچ گئے تو جاتے وقت ہمیں دے دینا ورنہ یہ مال تمہارا ہے''۔

یہ مال کوئی اور چیز نہیں دو سیر سونا، 180 اشرفیاں اور 20 سیر چاندی تھی جب ایک روز غازی احمد کو خصوصی ٹرین کے جانے کی اطلاع ملی تو یہ بوری کو سائیکل پر رکھ کر جیسے تیسے چکوال کیمپ پہنچ گئے۔ اور وہ بوری جوں کی توں خالہ کے سپرد کر دی۔ آن کی آن یہ خبر سارے کیمپ میں پھیل گئی کہ ایک مسلمان نے جو پہلے ہندو تھا اتنا بہت سا سونا چاندی واپس کیا ہے۔ یہ سنتے ہی بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔

ایک ہندو: بڑی بات ہے جناب، اس مسلمان نے کمال کر دیا۔ ورنہ سونا چاندی کون چھوڑتا ہے۔

دوسرا ہندو: اب مسلمان ہو گیا ہے تو کیا ہوا۔ خون تو ہندو ہی ہے۔ دیانت دار کیوں نہ ہوتا۔

غازی احمد: حضرت، آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ اگر میں مسلمان نہ ہوتا تو یہ مال کب کا ٹھکانے

لگا چکا ہوتا۔ اسلام کہتا ہے کہ امانت میں خیانت بدترین جرم ہے۔

والدہ غازی احمد: بھگوان تجھ سے خوش ہو۔ تو نے میری لاج رکھ لی۔

خالہ: جگ جگ جئے میرا پتر سدا سکھی رہے۔

خالو: تمہاری مہربانی ہے۔ کرشن لال ورنہ ہم تمہارا کیا بگاڑ لیتے۔

غازی احمد: میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اسلام نے مجھے سکھایا ہے کہ امانت جوں کی توں واپس کرو۔

دوسرا ہندو: اگر سب مسلمان تمہاری طرح کے ہوتے تو ہم اپنی جنم بھومی چھوڑ کر ہرگز نہ جاتے۔

☆☆☆☆☆

اللہ کی خوشنودی کی خاطر رشتہ

نومسلم غازی احمد اپنی سوانح حیات ''من الظلمات الی النور'' میں لکھتے ہیں:

''نومبر 1948ء میں میں ڈی بی مڈل سکول نور پور ضلع جہلم میں پہلی بار بطور استاد مقرر ہوا تھا۔ اس ملازمت کے دوران نور پور کے ایک بہت ہی معزز اور مقتدر بزرگ قاضی محمد رشید صاحب ایک روز سکول تشریف لائے۔ ان کا لڑکا محمد امین ساتویں کلاس میں میرے پاس پڑھتا تھا۔ پہلے تو کافی دیر بچے کی تعلیم و ترقی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر از راہ شفقت میری خیر و عافیت پوچھی اور چلے گئے۔ میں نے اس ملاقات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ چونکہ طلباء کے والدین اور سرپرستوں سے میں ملتا ہی رہتا تھا۔ دوسرے دن قاضی صاحب تشریف لائے تو یہ گفتگو ہوئی۔

قاضی محمد رشید: غازی صاحب، ایک ذاتی بات پوچھنا چاہتا ہوں۔

غازی احمد: فرمایئے۔

قاضی محمد رشید: کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟

غازی احمد: ابھی نہیں۔

قاضی محمد رشید: کہیں بات پکی ہو چکی ہے۔

غازی احمد: بات کئی جگہ چلی ضرور مگر ابھی بات پکی نہیں ہوئی۔

قاضی محمد رشید: کل میں نے گھر جا کر اپنی بیوی سے آپ کا تذکرہ کیا تھا۔ انہیں یاد ہے کہ آپ نے کتنی کم عمری میں اسلام قبول کیا تھا اور کن صبر آزما مرحلوں سے گزرے۔ وہ آپ کے کردار سے بہت متاثر ہیں۔

غازی احمد: یہ ان کی شفقت ہے۔

قاضی محمد رشید: آگے تو سنیئے۔ بڑے سوچ بچار کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی بڑی بیٹی کا رشتہ آپ کو دیں۔

غازی احمد: قاضی صاحب یہ آپ کا کرم ہے لیکن آپ نے میرے حالات تو معلوم ہی نہیں کیے۔

قاضی محمد رشید: ہم نے آپ کے حالات کو نہیں، آپ کو دیکھا ہے، ہم صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر یہ رشتہ آپ کو دے رہے ہیں۔ اگر آپ قبول کریں گے تو ہمیں خوشی ہوگی۔

پرنسپل غازی احمد لکھتے ہیں ''اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں فضل و کرم سے مجھے ایک صالحہ بیوی سے نوازا۔ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن کیا پکڑا کہ اللہ تعالیٰ نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں سے میری جھولی کو بھر دیا۔

☆☆☆☆☆

پھر ضمیر زندہ نہیں رہے گا

ٹیچرز ٹریننگ کالج لاہور کے استاد الحاج فضل احمد صاحب سے استادوں کی کئی نسلوں نے فیض پایا۔ وہ صاحب علم ہی نہیں صاحب نظر استاد تھے۔ فضل احمد صاحب سے ان کے ایک نامور

شاگرد غازی احمد کی گفتگو سنیئے:

غازی احمد: جناب، آپ تو پیریڈ لینے میں بہت ہی زیادہ محتاط ہیں۔

فضل احمد: ہونا چاہیے، یاد رکھیئے اگر کبھی آپ نے ایک پیریڈ بھی ترک کیا۔

غازی احمد: بلا عذر۔

قاضی احمد: جی ہاں، اگر ایک پیریڈ بلا عذر ترک کیا یا فرائض منصبی میں کسی عنوان سے کوتاہی کی تو آپ کا ضمیر زندہ نہیں رہے گا۔

☆☆☆☆☆

مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے

زیادہ نہیں تقسیم سے چند سال پہلے کی بات ہے۔ امرتسر کے خالصہ ہائی سکول کے دو لڑکوں میں کسی بات پر تو تکار ہو گئی۔ ان میں سے ایک سکھ تھا اور دوسرا مسلمان۔ زیادتی کس کی تھی یہ علیحدہ بات ہے۔ لیکن جوں ہی مسلمان بچے نے جھوٹ بولا، سکھ لڑکے نے چھوٹتے ہی کہا۔

''ابے مُسلے، تُو مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔''

اسی نوعیت کا ایک واقعہ کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولتا، تاریخ کی کتابوں میں مُلّا جیون کے بارے میں مذکور ہے۔ مُلّا جیون اورنگ زیب کے استاد تھے۔ کبھی قرآن حکیم پڑھایا تھا، لیکن تھے بہت سیدھے سادے، اللہ کے نیک بندے۔ کسی نے ان سے مذاق کیا کہ آپ کے مکان کو گرا دیا جائے گا۔ سامنے سے سڑک نکالی جائی گی۔ انہوں نے اسے سنجیدگی سے لیا ور سیدھے اپنے حکمران شاگرد کے پاس پہنچے۔

مُلّا جیون: اورنگ زیب، کیا ظلم ہو رہا ہے؟

عالمگیر: کون سا ظلم، مُلّا صاحب؟

مُلّا جیون: میں نے سنا ہے کہ تمہارے آدمی میرا مکان گرانے والے ہیں۔ وہاں سے کوئی

سڑک نکال رہے ہیں۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ جمنا کا پل اٹھا کے لا رہے ہیں۔ اسے یہاں رکھیں گے۔

عالمگیر: (ہنس کر) مُلّا صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں، کہیں جمنا کا پل بھی اٹھا کے لایا جاسکتا ہے؟

مُلّا جیون: (غصہ سے) خدا کی قسم، مجھ سے یہ بات ایک مسلمان نے کہی ہے۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ جمنا کا پل وہاں سے اٹھ کر یہاں آ سکتا ہے مگر مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔

ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ میں کچھ مبالغہ بھی ہو کہ ''بڑھا بھی لیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے''۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک زمانہ میں جس کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا، مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ زیادہ تھی۔ معاملات میں بھی اور تجارت میں بھی، اور اگر کبھی کوئی مسلمان جھوٹ بولتا تو غیر مسلم کہا کرتے تھے:

''مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔''

اچھے برے لوگ ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ آج بھی سچے اور کھرے مسلمانوں کی کمی نہیں۔ بات عام رجحان کی ہے۔

☆☆☆☆☆

میرا مقصدِ زندگی، تعلیم دینا اور تعلیم حاصل کرنا ہے

مشہور مورخ، دانشور اور پاکستان پر کلاسیکی کتاب ''جدوجہد آزادی'' کے مصنف ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جس زمانے میں سینٹ سٹیفن کالج، دہلی میں تاریخ کے استاد تھے۔ حکومت ہند نے ان کی صلاحیت اور قابلیت کی بناء پر کالج کے پرنسپل کے توسط سے انہیں ایک اعلیٰ عہدے کی پیش کی۔ پرنسپل نے انہیں دفتر میں بلایا۔

پرنسپل: قریشی صاحب، میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، حکومت نے آپ کو ایک اعلیٰ

عہدے کے لئے منتخب کیا ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق: مبارک باد کا شکریہ۔ لیکن مجھے اس پیشکش سے دلچسپی نہیں۔

پرنسپل: کیوں؟ ایسا موقع کسے ملتا ہے، اعلیٰ عہدہ، اعلیٰ تنخواہ، اس جگہ پر آپ کی تنخواہ موجودہ تنخواہ سے چار گنا زیادہ ہوگی۔

ڈاکٹر اشتیاق: میں کالج میں جو ملازمت کر رہا ہوں وہ صرف پیسہ کمانے کے لئے نہیں کر رہا۔ بلکہ میرے پیش نظر ایک مقصد ہے، وہ یہ کہ میں تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ اور تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اور تعلیم ہی کو اپنا پیشہ رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے اگر اس وقت میں صرف زیادہ تنخواہ کے لالچ میں آ کر اپنی آئندہ ترقیوں کی سمت بدل دوں تو میرا مقصدِ زندگی فوت ہو جائے گا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے رفیق کار اور دیرینہ دوست ڈاکٹر بلال احمد زبیری لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے دوستوں، رفقاء کار اور پرنسپل نے بڑا اصرار کیا کہ گورنمنٹ کی پیشکش قبول کر لیں۔ لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ ان کا جواب ایک ہی تھا، میری منزل اور ہے، میرا راستہ اور ہے۔

☆☆☆☆☆

دشمنی کا مزا

دنیا دوستی دشمنی کا میلہ ہے۔ اچھے برے تعلقات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کبھی وار کرنا پڑتا ہے، کبھی وار سہنا پڑتا ہے۔ لیکن اچھے شریف النفس لوگ دوستی اور دشمنی میں بھی کچھ اصولوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔

شورش کاشمیری کی زبان اور قلم دونوں میں آگ بھری تھی۔ اس سے زیادہ تر انہوں نے صحیح کام لیا، لیکن مزاج میں گرمی و تیزی تھی، تعلقات میں بھی اسی تندی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بہت اچھے دشمن بھی تھے۔

اچھا دشمن کیا ہوتا ہے، اس کا مظاہرہ اس مکالمے سے ہوتا ہے جو احسان دانش نے ''جہانِ دانش'' میں شورش سے متعلق نقل کیا ہے۔

شورش کے جن صاحب سے تعلقات کشیدہ تھے اور جن سے ان کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی وہ سرکاری عتاب کا شکار ہو کر جیل جا پہنچے تو ان کے مخالفوں کی بن آئی۔ ان میں سے کچھ شورش کے پاس آئے۔

ملاقاتی: شورش صاحب، کچھ سنا آپ نے ...... صاحب تو جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ تھے بھی اسی قابل، اب پردہ چاک ہوا۔

شورش صاحب، اب اچھا موقع ہے۔ اب ان حضرت کا کچا چٹھا چھاپئے تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ یہ کیا چیز ہیں۔ مواد ہم مہیا کریں گے۔

شورش: اس سے پہلے مجھے موت آ جائے جب میں کسی مصیبت زدہ انسان کی پریشانیوں میں اضافہ کروں۔ اور اپنے قلم کو اس کے خلاف جنبش دوں۔ اب تو اگر موقع آیا تو میں اس کی مدد کروں گا۔ مرد اس طرح دشمنی نہیں کرتے جس طرح آپ مشورہ دے رہے ہیں۔ خدا اس پر رحم فرمائے۔ دشمنی کا مزہ تو آمنے سامنے رہ کر آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اگر ایمان سے خالی مروں تو کتا مجھ سے بہتر ہے

بخارا کے ایک عالم شیخ جمال الدین ایک مرتبہ کاشغر کے ایک جنگل سے گزرے۔ یہ جنگل تاتاری امیر کی مخصوص شکار گاہ تھا جہاں عام لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ تاتاری سپاہی شیخ کو گرفتار کر کے اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ تاتاری سردار اس وقت اپنے شکاری کتے کو گوشت کھلا رہا تھا۔ نہ جانے وہ اس وقت کس خیال میں تھا کہ شیخ کو دیکھ کر اس نے یکا یک اپنے کتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

''تم اچھے ہو یا یہ کتا؟''

شیخ: اگر میں ایمان کی حالت میں اس دنیا سے اٹھ گیا تو میں بہتر ہوں اور اگر میں اس حال میں مروں کہ میرا سینہ ایمان کے نور سے خالی ہو تو یہ کتا مجھ سے بہتر ہے۔

سردار: (پہلے چونک کر اور سوچ کر) اس وقت میں صرف ولی عہد ہوں۔ جب تاج و تخت مل جائے تو تم پھر آنا۔ اس وقت میں اسلام قبول کر لوں گا۔

شیخ کی ایک نظر سے سردار کا سینہ کھل چکا تھا۔ شیخ جمال الدین امیر کی بادشاہت کا کئی سال انتظار کرتے رہے۔ پھر ان کا آخری وقت آن پہنچا تو اپنے بیٹے کو بلا کر وصیت کی کہ امیر تغلق تیمور جب بادشاہ بنے تو اس کے پاس جانا اور اس کا ایک وعدہ یاد دلانا۔

جب امیر بادشاہ بن چکا تو شیخ صاحب کے صاحب زادے امیر سے ملاقات کیلئے گئے۔ لیکن جب ملاقات نہ ہو سکی تو انہیں ایک انوکھی تدبیر سوجھی۔ انہوں نے امیر کے محل کے قریب کھڑے ہو کر بلند آواز سے فجر کی اذان دی۔ اذان سے امیر کی آنکھ کھل گئی۔ بہت غصے ہوا۔ اور نیند میں خلل ڈالنے پر شیخ زادے کو طلب کیا۔ اور ایسا کرنے کی وجہ دریافت کی۔ تو انہوں نے اسے وعدہ یاد دلایا جو اس نے شیخ جمال الدین سے کیا تھا۔ امیر تغلق تیمور کو وہ برسوں پہلے کا واقعہ یاد آ گیا اور برضا و رغبت مسلمان ہو گیا۔ اس کے ساتھ بہت سے فوجی افسروں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح تاتاریوں پر اسلام کے دروازے کھل گئے۔

☆☆☆☆☆

جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا

دمشق میں ایک بزرگ تھے شیخ سعید حلبی نام کے جو محلہ میدان کی مسجد میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل اور رشد و ہدایت دونوں کا بہت چرچا تھا۔ حاکم وقت سلطان ابراہیم پاشا کو شیخ کی زیارت کا شوق ہوا۔ چنانچہ 831ء میں ایک دن سلطان شیخ سے ملنے آیا۔ شیخ کو سلطان کے آنے کی پہلے سے اطلاع تھی۔ لیکن وہ اس کے استقبال کیلئے باہر نہیں نکلے، سلطان مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ شیخ اپنے شاگردوں کے حلقہ میں پیر پھیلائے بیٹھے ہیں۔ اور درس دے رہے ہیں۔ شیخ نے سلطان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ سلطان قریب آ کر کھڑا رہا۔ اور شیخ بدستور درس دینے میں محو رہے۔

کچھ دیر بعد شیخ نے نظر اٹھا کر سلطان کی طرف دیکھا۔ اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود اسی طرح پاؤں پھیلائے درس دینے میں مصروف رہے۔ سلطان ابراہم پاشا دیر تک شیخ کی باتیں توجہ سے سنتا رہا۔ اس کا دل گداز ہوا۔ اور وہ دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سلطان سلام کر کے رخصت ہوا اور محل میں پہنچتے ہی ایک تھیلی قاصد کے ہاتھ شیخ کے پاس بھیجی۔

قاصد: سلطان ابراہیم پاشا نے آپ کی خدمت میں ہزار دینار بھیجے ہیں۔

شیخ: کس لئے؟

قاصد: صرف ہدیہ کے طور پر،

شیخ: مجھے ان دیناروں کی ضرورت نہیں۔ بہتر ہے کہ تم یہ تھیلی واپس لے جاؤ۔

قاصد: کیوں؟

شیخ: سلطان کو میرا اسلام عرض کرنا۔ اور کہنا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے، وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا۔

☆☆☆☆☆

دوسرا رخ بھی تو دیکھو

اسلام میں بادشاہت نہیں ہے۔ اس لئے مطلق العنان بادشاہوں کی حکومت کو صحیح معنوں میں اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا۔ یہی حال عباسی خلفاء کا تھا۔ وہ ایک حد تک مطلق العنان ضرور تھے۔ لیکن ان کے دور میں بھی عدل وانصاف کا نظام بڑی حد تک شریعت کے مطابق تھا۔

مشہور عباسی خلیفہ معتصم باللہ بڑے دبدبے کا حکمران تھا۔ اس کا ایک جرنیل تھا، بغا نام کا، اس کا شمار بھی ارباب اقتدار میں تھا۔ معتصم باللہ کے مزاج میں اسے بڑا دخل تھا، اس وجہ سے اور بھی اس کا رعب داب تھا، ایک دنیا اس سے ڈرتی تھی۔

ایک بار اس کے بیٹے موسیٰ کا مقدمہ قاضی احمد بن بدیل کے سامنے پیش ہوا۔ موسیٰ کے کارندے نے محسوس کیا کہ مقدمہ کا رخ موسیٰ کے خلاف ہے۔ کارندے اور قاضی کے مابین یہ

گفتگو ہوئی:

کارندہ: قاضی صاحب، مجھے مقدمہ کی اٹھان سے اندازہ ہو رہا ہے کہ فیصلہ کا رخ کس طرف ہے۔

قاضی احمد: مجھے تو حقائق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔

کارندہ: لیکن میں آپ کی توجہ ایک اور حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا تھا۔

قاضی احمد: وہ کیا؟

کارندہ: وہ یہ کہ مقدمہ موسیٰ بن بفا کا ہے۔

قاضی احمد: اللہ تمہاری عزت برقرار رکھے، میرے بھائی، دوسرے رخ پر بھی تو نظر ڈالو۔ دوسری طرف معاملہ اللہ تبارک تعالیٰ کا ہے۔

☆☆☆☆☆

دنیا تو میں نے خدا سے بھی نہیں مانگی

ایک بار حج کے موقع پر اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک خانہ کعبہ میں حاضر ہوا تو وہاں حضرت عمر فاروقؓ کے پوتے حضرت سالم کو دیکھا۔ پہچان کر خلیفہ ان کے قریب گیا اور کہا:

"حضرت، مجھے خدمت کا موقع دیا جائے اور حکم فرمایا جائے، جس کی تعمیل کا شرف حاصل کر سکوں۔"

حضرت سالم نے جواب دیا۔

اللہ کے گھر میں اللہ کے سوا کسی اور سے مانگنا شرم کی بات ہے۔

جب دونوں خانہ کعبہ سے باہر نکلے تو یہ گفتگو ہوئی:

خلیفہ ہشام: حضرت اب تو آپ کعبہ شریف سے باہر ہیں۔ اب تو کچھ طلب فرمائیں۔

حضرت سالم: دنیا تو میں نے اس کے مالک حقیقی سے بھی کبھی طلب نہیں کی۔ پھر آپ سے، جو اس کے مالک بھی نہیں، کیسے مانگوں؟

☆☆☆☆☆

فقر کی پہلی منزل

ایک روز علامہ اقبال کی محفل میں فقر اور درویشی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ راجہ حسن اختر بھی بیٹھے تھے، پوچھا فقر کی پہلی منزل کیا ہے؟

علامہ اقبال: فقر کی پہلی منزل کسبِ حلال ہے۔ نورِ ایمان بھی کسب حلال سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ بغداد کے ایک بزرگ کی ہمشیرہ قاضی شہر کے پاس گئیں اور سوال کیا، ہم غریب ہیں اور ہمارے گھر میں روشنی کا کوئی سامان نہیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک آدمی رہتا ہے۔ اس کی شمعوں کی روشنی ہمارے صحن میں پڑتی ہے، میں اس روشنی میں مطالعہ کرتی ہوں، فرمایئے کہ شریعت کی رو سے پڑوسی کے گھر کی روشنی کا یہ استعمال حلال ہے یا حرام؟ قاضی تقویٰ کا یہ لطیف احساس دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ پوچھا آپ کون ہیں۔ خاتون نے جواب دیا، میں فلاں درویش کی ہمشیرہ ہوں۔ قاضی نے کہا، آپ کے لئے حرام ہے، دوسروں کیلئے حلال۔

راجہ حسن اختر کا بیان ہے کہ اس ذکر سے علامہ پر سخت رقت طاری ہو گئی۔ جس سے سب ہم نشیں متاثر ہوئے۔

☆☆☆☆☆

نقصان میں بھی الحمدللہ، نفع میں بھی الحمدللہ

ایک بہت بڑے بزرگ کا پیشہ تو اگرچہ تجارت تھا لیکن جو وقت اللہ کی عبادت سے بچتا تھا وہ اللہ کے بندوں کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ بغداد کے ایک بڑے مدرسے میں درس دیتے

تھے اور ایک دنیا ان کے درس سے فیض پاتی تھی۔ ایک روز حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کا کارندہ گھبرایا ہوآیا اور کہا، حضرت غضب ہوگیا، جو جہاز آپ کا مال لے کر آ رہا تھا وہ سمندری طوفان میں غرق ہوا۔ آپ نے درس دیتے ہوئے سر اٹھایا، ایک لمحے توقف کیا اور کہا، الحمدللہ۔ اور پھر درس میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ کارندہ پھر آیا اور کہا، حضرت، مبارک ہو، وہ پہلی خبر غلط تھی، جہاز صحیح سلامت بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا ہے۔ وہ کوئی اور جہاز تھا جو غرق ہوا تھا۔ بزرگ نے پھر تھوڑا سا توقف کیا اور الحمدللہ کہہ کر پھر درس دینے میں مصروف ہو گئے۔ جب درس ختم ہوا تو ایک شاگرد سے یہ گفتگو ہوئی۔

شاگرد: حضرت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جہاز کی غرقابی کی خبر پر بھی آپ نے الحمدللہ کہا وراس کی سلامتی کی خبر پر بھی الحمدللہ فرمایا۔ نفع کی صورت میں الحمدللہ کہنا تو خیر ٹھیک ہے لیکن نقصان کی صورت میں الحمدللہ کہنے میں کیا مصلحت تھی؟

بزرگ: مصلحت نہیں، ضرورت تھی۔

شاگرد: اگر مناسب سمجھیں تو وضاحت فرمائیں۔

بزرگ: مال دینے والا اللہ ہے، فائدہ میں بھی ہماری بھلائی، نقصان میں بھی ہماری بھلائی۔ اللہ رحیم ہے، کریم ہے۔ رب عظیم ہے، رب اعلیٰ ہے، وہ بہتر سمجھتا ہے کہ ہمارے لئے اچھا کیا ہے، بُرا کیا ہے۔

جب مجھے جہاز کی غرقابی کی اطلاع ملی تو ایک لمحے کیلئے میں نے دل میں جھانک کے دیکھا تو اس میں پیسے کے نقصان کا کوئی ملال نہیں تھا، دل راضی بہ رضائے الٰہی تھا۔ اس نعمت کے لئے میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

شاگرد: اور نفع کی اطلاع کی صورت میں؟

بزرگ: اس وقت پھر میں نے دل میں جھانکا، اس میں نفع کے امکان کی خبر سے کوئی خاص خوشی نہ تھی، میں نے دل کو غنی پایا۔ اس توفیق کیلئے پھر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا، کہ میرے اللہ نے مجھے پیسے کی محبت سے محفوظ رکھا۔

یہ بزرگ کوئی اور نہیں، حضرت غوث اعظمؒ تھے۔

☆☆☆☆☆

زیتون کا تیل

محمد بن سیرین حدیث وفقہ کے بڑے عالم بھی تھے۔ اور تاجر بھی اور دونوں میدانوں میں ایک ممتاز مقام پایا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے زیتون کا تیل خریدا۔ چالیس ہزار درہم کا۔ دوسرے روز ان کی اپنے خادم سے یہ گفتگو ہوئی۔

محمد بن سیرین: زیتون کا سارا تیل آچکا؟

خادم: جی جناب۔

محمد بن سیرین: تیل ٹھیک ہے؟

خادم: تیل تو ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات غلط ہوگئی ہے۔

محمد بن سیرین: کیا؟

خادم: تیل کے ایک کنستر میں سے ایک مرا ہوا چوہا نکلا ہے، اتفاقاً کولھو میں پل گیا ہوگا۔

محمد بن سیرین: اچھا۔

خادم: جی، میرا خیال تو یہ ہے کہ چوہے کو نکال کے پھینک دیتے ہیں۔

محمد بن سیرین: صرف چوہے کو پھینک دینا کافی نہ ہوگا۔ میرے خیال میں سارا تیل مشکوک ہو گیا ہے۔ اس لئے تم یہ سارا تیل پھینک دو۔

خادم: سارا تیل پھینک دوں؟

محمد بن سیرین: ہاں، سارا تیل پھینک دو، خبردار ایک قطرہ اس میں سے کسی کو نہ بیچا جائے۔

ناپاک چیز کا بیچنا حرام ہے۔

تاریخ میں ہے کہ محمد بن سیرین نے اصرار کر کے سارا تیل پھنکوا دیا۔ جس سے خریدا تھا اس نے قیمت طلب کی، چالیس ہزار درہم۔ اتنا سرمایہ نہ تھا کہ یہ نقصان پورا ہو جاتا۔ ناچار قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ خوشی سے اس مصیبت کو جھیل لیا۔ لیکن دھوکے سے مال بیچنا منظور نہ کیا کہ حرام کھانے سے تو جیل جانا بہتر ہے۔

☆☆☆☆☆

قیمت اور بڑھایئے

ایک بزرگ جریر بن عبداللہ تھے، انہیں ایک گھوڑے کی ضرورت ہوئی۔ ان کے ایک غلام کو گھوڑوں کی پہچان تھی۔ اس کو دام دیئے اور وہ منڈی سے ایک نہایت اعلیٰ گھوڑا خرید لایا۔

جریر: گھوڑا لاجواب ہے۔ ایسا گھوڑا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

غلام: اور میرے آقا، یہ کوڑیوں کے مول مل گیا۔

جریر: یہ ہزار بارہ سو درہم سے کم کی چیز نہیں تم نے کتنے دیئے؟

غلام: میرے آقا، کم، بہت ہی کم!

جریر: پھر بھی۔

غلام: صرف تین سو درہم!

جریر: تین سو درہم؟ کیا کہہ رہے ہو، تین سو درہم میں تو یہ مفت ہے۔

غلام: جی میرے آقا۔ میں نے تین سو درہم ہی اس کی قیمت ادا کی ہے۔ آپ نے مجھے ہزار درہم دیئے تھے۔ میں سات سو درہم بچا لایا ہوں۔

جریر: کیا اس گھوڑے کے مالک نے اپنی خوشی سے یہ سودا کیا؟

غلام: جی ہاں، میں نے اس کی منہ مانگی قیمت ادا کی ہے۔

جریر: وہ شخص اپنے ہوش و حواس میں تھا؟

غلام: جی ہاں، بالکل، اس نے جو قیمت مانگی، میں نے ادا کر دی۔ اس میں قطعاً کوئی دھوکا نہیں۔

جریر: مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ گھوڑا اس قیمت پر مل سکتا ہے۔ تم ابھی جاؤ اور منڈی سے اس سوداگر کو ڈھونڈ کے میرے پاس لاؤ۔ جس نے یہ مشکی گھوڑا تمہارے ہاتھ بیچا ہے۔

چنانچہ غلام گیا اور تھوڑی دیر کے بعد گھوڑے کے مالک کو ڈھونڈ لایا۔

جریر: میرا غلام آپ سے ہی ایک گھوڑا خرید لایا ہے؟

مالک: جی ہاں۔

جریر: اس غلام نے کتنی رقم آپ کو ادا کی؟

مالک: پورے تین سو درہم۔ آپ کا غلام بہت اچھا ہے۔ اس نے میرے ساتھ زیادہ تول مول نہیں کیا۔ جو رقم میں نے بتائی، اس نے خاموشی سے وہ مجھے دے دی۔

جریر: آپ اس سودے سے مطمئن ہیں؟

مالک: جی ہاں، بالکل مطمئن ہوں۔ مجھے میرے گھوڑے کے منہ مانگے دام مل گئے۔ اور کیا چاہیے؟

جریر: واقعہ یہ ہے کہ تمہارا گھوڑا قیمتی ہے۔ تین سو درہم کم ہیں۔ اس لئے میں آپ کو آپ کا گھوڑا واپس کرتا ہوں۔ آپ دوبارہ اس کی قیمت کا تعین کر سکتے ہیں۔

مالک: آپ چار سو درہم دے دیجئے۔

جریر: یہ بھی کم ہیں۔

مالک: پانچ سو درہم دیجئے۔

جریر: میرے دوست، آپ اب بھی کم مانگ رہے ہیں۔

مالک: اگر یہ کم ہیں تو چھ سو سہی۔

جریر: کچھ اور بڑھایئے، آپ کا گھوڑا بہت قیمتی ہے۔

مالک: تو سو اور بڑھا دیجئے۔

جریر: آپ کو شاید گھوڑے کی نسل کا اندازہ نہیں۔ اس کی صحیح قیمت اس سے بھی زیادہ ہے۔

مالک: تو کیا آٹھ سو درہم؟

جریر: ہاں آٹھ سو درہم اس کی جائز قیمت بنتی ہے۔ اس لئے میں آپ کو آٹھ سو درہم ادا کروں گا۔

مالک: لیکن آپ مجھے یہ بتایئے کہ آپ تین سو کی بجائے آٹھ سو درہم کیوں دے رہے ہیں جب کہ یہی چیز آپ کو تین سو میں مل سکتی تھی؟

جریر: رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے، اگر بیچنے والا ضرورت مند ہو یا اسے چیز کے صحیح دام معلوم نہ ہوں تو اس سے اونے پونے چیز خریدنا گناہ ہے۔ جس طرح بیچتے وقت زائد قیمت لینا حرام ہے اسی طرح خریدتے وقت کم قیمت دینا بھی حرام ہے۔

☆☆☆☆☆

بادل دیکھ کے دکان بڑھا دی

حضرت یونس بن عبید کی کپڑے کی اچھی بھلی دکان تھی اور خوب چلتی تھی۔ آسمان پر بادل گھر کے آئے تو انہوں نے دکان بڑھا دی۔ لوگوں کو تعجب ہوا، کسی نے پوچھا۔

آپ دکان کیوں بند کر رہے ہیں، ابھی تو دن پڑا ہے؟

حضرت یونس: ابر کے وقت کوئی گاہک آ گیا تو کیا کروں گا۔

ہمسایہ: کیا مطلب؟

حضرت یونس: نہ اسے لوٹا سکتا ہوں کہ یہ بداخلاقی ہوگی اور نہ اسے مال دکھا سکتا ہوں کہ بددیانتی ہوگی۔

ہمسایہ: کس طرح؟

حضرت یونس: آپ دیکھتے ہیں کہ میں چادریں اور اوڑھنیاں بیچتا ہوں، بادلوں کی وجہ سے اندھیرا ہو رہا ہے۔ ایسے میں خریدار کو مال کا عیب و ہنر نظر نہ آئے گا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی گاہک عیب دیکھے بغیر خرید لے۔ یہ خریدار کے ساتھ انصاف نہ ہو گا۔ میں ذرا سے نفع کو دوزخ کی آگ پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

☆☆☆☆☆

ماں کا مرتبہ

کہمش بن حسن ایک فرشتہ خصلت بزرگ تھے۔ ان کی والدہ بہت بوڑھی تھیں۔ وہ ہمہ وقت ان کی خدمت میں مصروف رہتے۔ ان کے دوست سلیمان بن علی ایک روز ان کے ہاں روپوں کی ایک تھیلی چھوڑ گئے۔ دوسرے روز دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

کہمش: روپوں کی تھیلی کل شام آپ یہاں چھوڑ گئے تھے؟

سلیمان: جی ہاں۔

کہمش: کس لئے؟ مجھے تو ان روپوں کی ضرورت نہیں۔

سلیمان: آپ کی والدہ بوڑھی ہیں نا۔

کہمش: جی، وہ تو ہیں۔

سلیمان: جب بھی میں آتا ہوں آپ ان کی خدمت میں مصروف ہوتے ہیں۔ آپ سے ملاقات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

کہمش: میرا بھی جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ وقت گزاروں۔ لیکن کیا کروں اس کا موقع ہی نہیں ملتا۔ لیکن ہاں آپ نے یہ نہیں بتایا کہ روپوں کی تھیلی کا کیا کرنا ہے۔ کیا امانتاً رکھنا ہے یا کچھ اور بات ہے؟

سلیمان: روپوں کی تھیلی اس لئے ہے کہ آپ ایک نوکر رکھ لیں۔

کہمش: نوکر کی ہمیں ضرورت ہی نہیں۔ گھر میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہم تین بندے ہیں۔ میں، میری بیوی اور بوڑھی ماں۔ بیوی گھر کا کام کاج کرتی ہے، میں سودا سلف لے آتا ہوں اور باقی وقت والدہ کی خدمت میں گزارتا ہوں۔ جو تھوڑی سی آمدن ہے، اللہ کا شکر ہے اس سے کام چل رہا ہے۔

سلیمان: نوکر رکھنے سے میرا یہ مطلب تھا کہ والدہ کی خدمت کیلئے آپ کوئی خادمہ رکھ لیں۔ تا کہ ان کی خدمت کا سارا بوجھ آپ پر نہ رہے۔

کہمش: بوجھ؟ کونسا بوجھ؟ والدہ کی خدمت کو آپ بوجھ کہہ رہے ہیں؟ یہ بوجھ نہیں، سرمایۂ سعادت ہے۔ عزیز دوست، میں خادمہ رکھنے کا مشورہ قبول نہیں کر سکتا۔ جب میں بچہ تھا تو میری اماں نے خود ہی میری خدمت کی اور مجھے پال پوس کر بڑا کیا اور میرا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کیا۔ حالانکہ اس وقت ان کی ایک نہیں کئی باندیاں تھیں۔ اب جب کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہیں اور ان کو میری خدمت کی ضرورت ہے تو میں ان کی خدمت کسی اور سے کراؤں، نہیں، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆☆☆

حج سے پہلے

ماں باپ کی خدمت کا درجہ اسلام میں کیا ہے، اس کا اندازہ ایک اور واقعہ سے ہو گا۔ مدینے میں ایک بہت بڑے بزرگ صحابی رہتے تھے۔ پہلے وہ ہر سال حج پر جایا کرتے تھے۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ صرف نماز کیلئے گھر سے نکلتے ہیں۔ حج کا زمانہ آتا اور مدینے سے مکے کی طرف قافلے چلتے تو یہ ان کو حسرت سے دیکھتے اور پھر گھر چلے جاتے۔ ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے نکلے تو چند دوست ساتھ ہو لئے۔

پہلا دوست: آج کل آپ مسجد سے باہر بالکل نظر نہیں آتے، گھر یا مسجد، کیا بات ہے؟

دوسرا دوست: کل آپ حج کے قافلے کو رخصت کرتے وقت اتنے اداس کیوں ہو گئے تھے؟

بزرگ: میرا بھی دل چاہتا ہے کہ کعبۃ اللہ کی زیارت کو جاؤں۔ لیکن میرے لئے ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔

پہلا دوست: کیوں، کوئی مشکل ہے؟ کچھ روپے پیسے کی بات ہے تو اس کا انتظام ہم آپ کیلئے کر دیتے ہیں۔

بزرگ: نہیں، روپے پیسے کی بات نہیں، زادِ راہ میرے پاس ہے۔

دوسرا دوست: کوئی اور رکاوٹ ہو تو بتایئے۔

بزرگ: آپ لوگ اصرار کرتے ہیں تو بتاتا ہوں، میں ایک اور اہم اور مقدس فریضے میں لگا ہوا ہوں۔ جب تک یہ اہم اور مقدس فریضہ ختم نہ ہو میں نفلی حج کیلئے نہیں جا سکتا۔

تیسرا دوست: آپ نے تو الجھن میں ڈال دیا، وہ کون سا کام ہے جو حج پر مقدم ہے۔

بزرگ: بات دراصل یہ ہے کہ میری والدہ بوڑھی ہیں، میں ان کی خدمت میں مصروف رہتا ہوں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ ان کی خدمت کسی اور سے کراؤں اور خود نفلی حج پر جاؤں۔

ایک حدیث مبارک میں ہے، ایک بار ایک صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا، جہاد میں شرکت کا ارادہ ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت لینا چاہتا تھا۔ رسول کریم نے فرمایا، تمہاری ماں زندہ ہے۔ انہوں نے کہا۔ جی ہاں، ارشاد ہوا، ماں کی خدمت میں لگے رہو، اللہ تعالیٰ نے جنت ماؤں کے قدموں تلے رکھی ہے۔

☆☆☆☆☆

جب خلیفہ وقت کی رعایت نہیں تو کسی اور کی رعایت کب کی ہوگی

شکایت بُروں ہی کی نہیں، اچھوں کی بھی ہوتی ہے بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ ایماندار آدمیوں کے پیچھے لوگ کم نہیں کچھ زیادہ ہی پڑتے ہیں۔ یہی بغداد کے قاضی عافیہ کے ساتھ ہوا۔ وہ تو اپنی طرف سے کانٹے کی تول انصاف کرتے تھے۔ لیکن شرپسند کہاں باز آتے ہیں۔ انہوں نے جھوٹی شکایتیں خلیفہ ہارون رشید کے کانوں تک پہنچانی شروع کر دیں۔ بڑے سے بڑا حاکم بھی آخر انسان ہی ہوتا ہے۔ جو بات دس بار سنتا ہے، ایک بار اس پر یقین بھی کر لیتا ہے۔ جب ہارون نے قاضی کے خلاف پاسداری کا الزام بار بار سنا تو ان کو دربار میں طلب کیا۔ قاضی تشریف لائے۔ ابھی بات شروع نہیں ہوئی تھی کہ ہارون کو یکا یک چھینک آئی اور دربار یرحمک اللہ کی دعاؤں سے گونج اٹھا۔ مگر قاضی عافیہ نے یرحمک اللہ نہیں کہا۔

ہارون الرشید: قاضی صاحب آپ نے مجھے دعا سے نہیں نوازا۔

قاضی عافیہ: یرحمک اللہ اس وقت کہا جاتا ہے، جب چھینکنے والا الحمدللہ کہے۔ آپ نے الحمدللہ کب کہا تھا جو میں یرحمک اللہ کہتا۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یہی تھا کہ آپ یرحمک اللہ نہیں کہا کرتے تھے اگر چھینکنے والا الحمدللہ نہیں کہا کرتا تھا۔

ہارون الرشید: بجا ارشاد فرمایا۔

قاضی عافیہ: آپ نے مجھے یاد کیا تھا، فرمایئے کیا بات ہے؟

ہارون الرشید: جواب طلب مسئلہ کا جواب مجھے مل چکا ہے، زحمت کرنے کا شکریہ۔

قاضی صاحب کے جانے کے بعد ہارون نے درباریوں سے کہا قاضی عافیہ کے خلاف پاسداری کی شکایت کی گئی تھی۔ انہوں نے میری رعایت نہیں کی تو کسی اور کی کیا کریں گے۔

☆☆☆☆☆

بچے کو دفنانے سے پہلے

بچہ بیمار تھا، ماں نے دوا بھی کی، دعا بھی کی، لیکن جو اللہ کو منظور تھا وہی ہوا۔ نہ دوا نے اثر کیا نہ دعا کام آئی اور بچہ صبح ہوتے ہوتے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ موت، موت ہے، بوڑھے کی موت بھی غم انگیز ہوتی ہے، یہ تو پھول سا بچہ ہنستا کھیلتا، دیکھتے دیکھتے کملا گیا تھا۔ اس حادثہ سے ماں باپ پر جو گزری تھی سو گزری تھی، پڑوسی بھی سوگوار تھے، جس نے سنا، پرسے کیلئے جمع ہوتا گیا۔

پہلا پڑوسی: حضرت بہت دکھ ہوا، بڑا پیارا بچہ تھا۔

دوسرا پڑوسی: کل تک ہی تو ہم نے اسے کھیلتے دیکھا تھا۔

تیسرا پڑوسی: بڑا ہونہار تھا۔

باپ: الحمدللہ، الحمدللہ، جس کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی، آپ لوگ دعا کیجئے۔

پڑوسی: ہمیں کوئی خدمت بتایئے۔

باپ: قبر کیلئے میں نے آدمی بھیج دیا ہے، کفن کیلئے کپڑے کے دو ٹکڑے گھر میں موجود ہیں، غسل دیا جا چکا ہے۔ بس آپ لوگوں سے ایک گزارش ہے۔

پڑوسی: فرمایئے، فرمایئے۔

باپ: گزارش یہ ہے کہ آپ لوگ بچہ کو دفنانے قبرستان پہنچایئے گا۔

پڑوسی: وہ تو ہم اسے اپنی گود میں اٹھا کے لئے جائیں گے، آپ کا بچہ ہمارا بچہ ہے۔

باپ: میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ امام صاحب کے درس کا وقت ہو رہا ہے۔

پڑوسی: تو کیا ہوا؟

باپ: جو اللہ کو منظور تھا وہ تو ہو چکا، میں اب اس کی زندگی واپس نہیں لا سکتا، لیکن کہیں زندگی بھر یہ حسرت نہ رہے کہ حضرت امام کا ایک درس صرف اس لئے چھوٹ گیا کہ بچے کو دفناتا رہا۔ میں حضرت کے درس کی روشنی سے ایک دن کیلئے بھی محروم نہیں رہنا چاہتا۔

اللہ اکبر! بچہ کو دفنانے سے زیادہ فکر علم کی فکر ہے، روشنی کی تلاش ہے، صبر وشکر کا یہ عالم ہے، یہ کوئی اور نہیں، حضرت امام ابوحنیفہ کے جلیل القدر شاگرد امام ابو یوسف تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سائے کی طرح حضرت امام کے ساتھ رہتے تھے اور علم و دانش کے موتی چنتے رہتے تھے۔

☆☆☆☆☆

میرے لئے معلّمی بہتر ہے

معلم کا بڑا رتبہ ہے بشرطیکہ معلم کو بھی اس مرتبے کا احساس ہو۔ مامون الرشید کے زمانے میں ابراہیم بن رستم نام کے ایک عالم تھے۔ شہر مرو میں ان کا قیام تھا اور بحیثیت عالم کے بھی ان کا بڑا شہرہ تھا۔

مامون مرو پہنچا تو ابراہیم کے علم و فضل کے چرچے سنے۔ اس نے انہیں بلا بھیجا۔

مامون: میں نے آپ کے علم و فضل کی بڑی تعریف سنی ہے۔

ابراہیم: میں اپنی خامیوں سے خوب واقف ہوں۔

مامون: میں چاہتا ہوں کہ آپ قاضی کا عہدہ قبول کریں اور خلق خدا کی خدمت کریں۔

ابراہیم: مجھے پڑھنا پڑھانا بہت پسند ہے، اسی سے مجھے خوشی ہوتی ہے، درس و تدریس

ہی کو خدمت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے قاضی کا منصب قبول کرنے سے قاصر ہوں۔

ابراہیم بن رستم تو دربار سے انکار کر کے چلے گئے لیکن مامون کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ اہل علم کا قدرداں تھا، وہ چاہتا تھا کہ وہ قاضی کا عہدہ قبول کر لیں اور اس منصب کے امتیازات سے استفادہ کریں، لیکن ابراہیم معلّمی سے خوش تھے۔ وزیر وزراء تو حکمران کا مزاج دیکھتے ہیں۔ جب مامون کے وزیر فضل برمکی نے دیکھا کہ خلیفہ ابراہیم کو قاضی بنانا چاہتا ہے تو وہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ابراہیم کے پاس ان کے مکتب میں خود پہنچا۔ فضل، مامون کے بعد ساری سلطنت عباسیہ کا سب سے زیادہ بااثر آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کا بذات خود چل کر ابراہیم بن رستم کے مکتب میں جانا بہت بڑی بات تھی، لیکن جن کے دل غنی ہوں وہ اہل دنیا کی کب پرواہ کرتے ہیں، چنانچہ فضل کی تعظیم کیلئے ابراہیم خود کھڑے ہوئے نہ ان کے طلبہ۔ اور پورے انہماک کے ساتھ درس جاری رہا۔ فضل برمکی کی اس طرح پذیرائی پر اس کے ایک مصاحب سے نہ رہا گیا، اس نے کہا،

ابراہیم: وزیر باتمکین، بنفس نفیس تم سے ملنے آئے ہیں اور تم دباغوں میں ایسے مستغرق ہو کہ ان کی تعظیم کیلئے بھی نہیں اٹھے۔

اس سے پہلے کہ ابراہیم بن رستم اس بات کا جواب دیتے، ایک طالب علم بول اٹھا۔ ہم دباغ سہی لیکن اس دین کی تحصیل کر رہے ہیں جس نے جناب ابراہیم کو یہ رتبہ دیا ہے کہ وزیر مملکت خود ان سے ملنے تشریف لائے ہیں۔

☆☆☆☆☆

لازوال دولت

ایک بہت بڑے بزرگ اور عالم کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے بیٹے نے جب قرآن مجید پڑھنا شروع کیا اور ان کے استاد نے اسے سورہ فاتحہ ختم کرائی تو یہ باتیں ہوئیں۔

بزرگ: بیٹے، تم نے سورہ فاتحہ ختم کرلی؟

بیٹا: جی، ابا جی۔

بزرگ: سناؤ۔

بیٹا: بیٹا، سورہ فاتحہ تلاوت کرتا ہے۔

بزرگ: سبحان اللہ، ماشااللہ، جب آپ کے استاد تشریف لائیں تو مجھے اطلاع دینا۔

بیٹا: بہت بہتر۔

جب بزرگ کو معلم کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ ہزار درہم کی تھیلی لے کر آئے۔

بزرگ: السلام علیکم۔

میں نے بچے سے سورہ فاتحہ سنی ہے، آپ نے بچے پر بڑی محنت کی ہے، تلفظ بھی درست ہے، سبحان اللہ، میں آپ کا بڑا ممنون ہوں، یہ حقیر نذرانہ قبول کیجئے۔

(تھیلی پیش کرتے ہیں)۔

معلم: یہ تو بڑی رقم معلوم ہوتی ہے۔

بزرگ: صرف ہزار درہم ہیں۔

معلم: ہزار درہم؟ میں نے کونسا بڑا کام کیا ہے کہ آپ اتنی بڑی رقم مجھے دے رہے ہیں۔

بزرگ: آپ نے جو کچھ میرے بچے کو سکھایا ہے اسے کم نہ سمجھیئے، اللہ کی قسم، اگر میرے پاس اس سے زیادہ رقم ہوتی وہ بھی میں بے تامل پیش کر دیتا۔ کیونکہ جو دولت میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں وہ ختم ہو جائے گی لیکن جو دولت آپ نے میرے بچے کو دی ہے وہ نہ صرف باقی رہے گی بلکہ بڑھتی چلی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

دو دمڑی کا قلم

ایک تابعی بزرگ عبداللہ بن مبارک جو بہت بڑے محدث تھے۔ اپنے وطن مرو سے کئی سو میل کا سفر کر کے شام گئے اور وہاں سے لوٹے تو مرو پہنچ کر انہوں نے دیکھا، ان کے پاس کسی کا قلم رہ گیا ہے۔ فوراً سامان سفر درست کیا اور دوبارہ شام کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ مہینوں راہ چل کر وہاں پہنچے اور اس شخص کو ڈھونڈا جس سے قلم مستعار لیا تھا۔

عبداللہ: لیجئے صاحب، آپ کا قلم حاضر ہے، دیر سے واپس کرنے کی معذرت چاہتا ہوں، میں غلطی سے اسے لے کر مرو چلا گیا تھا۔

مالک: تو گویا آپ مرو سے آ رہے ہیں؟

عبداللہ: جی ہاں۔

مالک: صرف یہ قلم واپس کرنے کیلئے آپ نے یہ سینکڑوں میل کا صبر آزما سفر کیا۔ یہ دو دمڑی کا قلم تھا، دو دمڑی کیلئے آپ نے زحمت کیوں اٹھائی ہے؟

عبداللہ: میرے بھائی سوال قیمت کا نہیں، نہ فاصلے کا ہے، سوال امانت کو واپس کرنے کا تھا۔ سورۃ نساء میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"مسلمانو! امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کرو۔"

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے امانت میں خیانت کرنے سے بچا لیا۔

☆☆☆☆☆

نفع کا عذاب

ایک تابعی بزرگ یونس بن عبید کپڑے کے بڑے تاجر تھے، ایک بار انہوں نے تیس ہزار درہم کا ریشم خریدا اور بہت سستے داموں خریدا، خریدنے کی دیر تھی کہ ریشم کی قیمت بڑھنے لگی اور دگنی

تنگی ہوگئی، بظاہر وارے نیارے ہو گئے۔ لیکن یونس بن عبید تو تابع تھے۔ صحابہ کرام کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، رزق حلال وحرام کا شعور رکھتے تھے۔ جائز و ناجائز منافع کا فرق جانتے تھے۔ انہیں مال بیچنے سے زیادہ ایک اور فکر پڑ گئی، منڈی کے اس بیوپاری کو ڈھونڈنے نکلے جس سے سستے داموں ریشم کی گانٹھیں خریدی تھیں، آخر اسے پالیا۔

بزرگ: میں آپ کو کئی دن سے تلاش کر رہا ہوں۔ میں نے تیس ہزار درہم کا ریشم آپ ہی سے خریدا تھا نا؟

بیوپاری: جی ہاں، اس میں کیا شک ہے، کیا مال میں کچھ خرابی تھی؟

بزرگ: نہیں، سارا مال ٹھیک ٹھاک ہے۔ ہر گانٹھ اچھی ہے۔

بیوپاری: پھر آپ مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے؟

بزرگ: بس ایک شبہ میں پڑ گیا تھا، اس کا ازالہ کرنا تھا۔

بیوپاری: فرمایئے۔

بزرگ: آپ کو معلوم ہے کہ وہ تیس ہزار درہم کا ریشم لاکھ درہم کا ہے۔ یہ بتایئے کہ جب آپ نے مجھ سے سودا کیا تو آپ کو قیمت کے چڑھنے کا علم تھا؟

بیوپاری: نہیں، اگر ہوتا تو ان داموں کیوں بیچتا۔

بزرگ: اگر یہ بات ہے تو میں آپ کی لاعلمی سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ آپ اپنا ریشم اٹھالیں اور میرے درہم مجھے واپس کر دیں۔ اللہ مجھے حرام کے نفع کے عذاب سے بچائے۔

حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا حلال روزی کمانا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں، حلال روزی کیلئے محنت کرنا نماز کے بعد سب سے بڑا فریضہ ہے۔

☆☆☆☆☆

اس نقصان میں بھی فائدہ ہے

خزینہ الاصفیاء میں حضرت سری سقطیؒ کا قصہ لکھا ہے، آپ کی پنساری کی دکان تھی، کھانے پینے کی چیزیں بیچتے تھے۔ ایک دفعہ ساٹھ ہزار دینار کے بادام انہوں نے اکٹھے خرید لئے، اتفاق سے کسی وجہ سے تھوڑے دنوں بعد باداموں کا بھاؤ چڑھ گیا۔ جس دلال نے پہلے باداموں کا سودا کروایا تھا وہ آیا۔

دلال: حضرت، بادام بیچ ڈالئے۔

سری سقطی: کیوں؟

دلال: اس لئے کہ باداموں کا بھاؤ یکا یک بہت چڑھ گیا ہے۔ دوگنے ہو جائیں گے۔

سری سقطی: ہاں، مجھے معلوم ہے لیکن اس طرح بیچوں گا نہیں۔

دلال: کیوں؟

سری سقطی: میں نے تو اللہ تعالیٰ سے عہد کر رکھا ہے کہ دس دینار پر آدھے دینار سے زیادہ نفع نہ لوں گا، ایسا نفع کس کام کا جو حرام کا ہو۔

☆☆☆☆☆

کھوٹا سکہ

غزالی نے احیاء العلوم میں ایک متقی کا ذکر کیا ہے، نام ابو عبداللہ تھا، شام کے علاقے میں رہتے تھے۔ کپڑے سی کر گزارہ کرتے تھے۔ ان کی دکان پر ایک یہودی کپڑے سلانے آیا کرتا تھا اور ہمیشہ کھوٹا سکہ دیتا۔ وہ جانتے بوجھتے وہ کھوٹا سکہ لے کر کپڑے اس کے حوالے کر دیتے۔

ایک روز اتفاق سے وہ دکان پر نہیں تھے۔ ان کا ملازم اپنے مالک کی جگہ بیٹھا تھا، وہ

یہودی اپنے کپڑے لینے آیا تو اس نے حسب معمول کھوٹا سکہ جیب سے نکالا، نوکر نے تاڑ لیا کہ کھوٹا ہے، فوراً واپس کیا، کہا دوسرا دیجئے۔ یہودی نے کھرا سکہ دیا اور اپنے کپڑے لے کر چلا گیا، جب ابوعبداللہ آئے تو ملازم نے بتایا۔

ملازم: میرے آقا، آپ کے پیچھے (فلاں) مجوسی آیا تھا، پیسے دے کر اپنے کپڑے لے گیا۔

ابوعبداللہ: (تھیلی دیکھتے ہوئے) کیا اس نے سلائی نہیں دی؟

ملازم: دی۔ کیوں نہیں دی۔ یہ یہودی بڑا چالاک ہے۔ یہ پہلے کھوٹا سکہ چلانا چاہتا تھا، میں نے اس کی چالاکی پکڑ لی، کھوٹا سکہ واپس کر دیا۔ اور کھرا وصول کیا۔ اور اس تھیلی میں ڈال دیا۔

ابوعبداللہ: کاش تو کھوٹا سکہ لے لیتا۔

ملازم: (حیرت سے) یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔

ابوعبداللہ: ہاں بیٹا، میں ٹھیک کہتا ہوں، برسوں سے میں اس سے کھوٹا سکہ لیتا رہا ہوں، میں نے کبھی اس سے شکایت نہیں کی، تم بھی اس سے کھوٹا سکہ لے لیتے۔

ملازم: کھوٹا سکہ لے لیتا؟ بھلا کیوں؟

ابوعبداللہ: اس لئے کہ اب وہ کھوٹا سکہ کسی اور مسلمان کو دینے کی کوشش کرے گا۔ میں چپ چاپ اس سے کھوٹا سکہ لے کر اندھے کنوئیں میں پھینک دیا کرتا تھا کہ دھوکا دہی کا یہ سلسلہ ہی ختم ہو۔ اللہ کے رسول صلی اللہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان اگر مسلمان کا خیر خواہ نہ ہو تو صاحب ایمان نہیں۔

☆☆☆☆☆

راز بھی ایک امانت

محمود غزنوی کا ایک وزیر باتدبیر تھا، حسن میمندی۔ اس میں بہت سے خوبیاں تھیں لیکن سب

سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ سے ڈرتا تھا۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ از خود دیانت دار اور امانت دار ہو جاتا ہے۔ امانت داری چیزوں اور پیسوں کی ہی نہیں، راز اور مشورے کی بھی ہوتی ہے۔ حسن میمندی اس لحاظ سے بھی امانت دار تھا۔ ایک بار بھرے دربار میں محمود نے حسن میمندی سے کچھ راز و نیاز کی باتیں کیں۔ درباریوں کو ٹوہ ہوئی کہ کیا بات ہے، کچھ پتہ تو چلے۔

دربار برخاست ہوتے ہی حسن کے یہاں درباریوں کا تانتا بندھ گیا، ایک جاتا تو دوسرا آتا۔

پہلا درباری: حسن صاحب، آج تو شاہ نے آپ کی بڑی عزت افزائی کی۔

حسن: جی ہاں، میرے ولی نعمت کا کرم ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔

درباری: کوئی خاص بات ہو گی؟

حسن: جی ہاں، بات تو خاص ہی تھی۔

درباری: کچھ، ہمیں بھی تو پتہ چلے۔

حسن: وقت آنے پر وہ بات آپ کو معلوم ہو جائے گی۔

درباری: اچھا، اب اجازت۔

حسن: بسم اللہ!

○

دوسرا درباری: حسن صاحب، مبارک ہو، امیر محمود پر آپ کا بڑا اثر ہے۔

حسن: کوئی خاص اثر نہیں۔ یہ میرے آقا کی نظر کرم ہے اور کچھ نہیں۔

دوسرا درباری: دوستوں سے کیا پردہ، مجھے کسی سے کہنا تھوڑا ہی ہے؟ کیا معاملہ ہے؟

حسن: جو معاملہ تھا وہ بہت جلد آپ پر ظاہر ہو جائے گا۔

دوسرا درباری: آپ دوستوں سے بھی تکلف برتتے ہیں۔

حسن: کیا کروں، اصول سے مجبور ہوں۔

دوسرا درباری: کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟

حسن: ہے، میں آپ کے راز کی بھی اس طرح پاسداری کروں گا۔

دوسرا درباری: اب میں چلا، پھر حاضر ہوں گا۔

حسن: بسم اللہ!

○

تیسرا درباری: حسن صاحب، جلنے والے جلا کریں لیکن میں تو خدا لگتی کہوں گا۔ واقعہ ہے کہ امیر محمود کو آپ پر بڑا اعتبار ہے، تبھی تو وہ آپ سے وہ باتیں کہہ دیتے ہیں جو وہ کسی سے نہیں کہتے۔

حسن: آپ کا حسن ظن ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔

تیسرا درباری: لیکن جو کرم آپ مجھ پر فرماتے ہیں اس کی وجہ سے مجھے خیال آیا کہ آپ سے پوچھوں کہ بادشاہ کے خیالات کا رخ کس طرف ہے، مجھے امید ہے کہ آپ ہمارے تعلقات کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے ضرور اس صورتحال سے آگاہ کریں گے۔

حسن: میں آپ کی دوستی کی قدر کرتا ہوں۔

تیسرا درباری: تو پھر کچھ اشارہ کیجئے۔

حسن: مجھے بات تو پوری کر لینے دیجئے، میں کہہ رہا تھا کہ میں آپ کی دوستی کی قدر کرتا ہوں، آپ نے ابھی کہا تھا کہ امیر محمود کو مجھ پر بڑا اعتماد ہے۔

تیسرا درباری: جی ہاں، اس میں کیا شک ہے۔

حسن: تو آپ نہیں چاہتے کہ میں اعتماد پر پورا اتروں؟

میرے ہمدم، میرے دوست، راز بھی ایک امانت ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

پانی کی ایک بوند

حضرت حارث بن ہشامؓ مشہور صحابی تھے۔ غزوہ حنین میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت میں نہایت پامردی سے لڑے۔ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں لٹاتے تھے۔ جنگ یرموک میں نہایت بہادری سے لڑے آخر سخت زخمی ہو کر گر پڑے، نزع کے وقت سخت پیاس محسوس ہوئی۔

حضرت حارثؓ: پانی، پانی۔

ایک مجاہد: یہ لیجئے۔ (پانی کی چھاگل منہ کو لگاتا ہے۔)

دوسرا زخمی: پانی۔

حضرت حارثؓ: (اشارے سے) یہ پانی اس کو پلاؤ۔

مجاہد: یہ لو پانی پیو۔

تیسرا زخمی: پانی، پانی۔

دوسرا زخمی: مجھے ضرورت نہیں، اس بھائی کو پلاؤ۔

جب یہ مجاہد تیسرے زخمی کے پاس پانی کی چھاگل لے کر پہنچا تو وہ شہادت سے ہم کنار ہو چکے تھے، جب حارثؓ اور دوسرے زخمی کی طرف پلٹا تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

ظلم سے ملک باقی نہیں رہ سکتا

ترکی زبان میں لفظ تیمور کے معنی لوہے، فولاد کے ہیں، مشہور فاتح امیر تیمور واقعی اسم بامسمّٰی تھا۔ خان تسلیم کیے جانے کے بعد اس نے اپنے لئے جہاں گیر اور گورگان کے القاب منتخب کئے۔ اس نے 36 سال حکومت کی اور اس عرصے میں اس نے دیوار چین سے لے کر اندرون روس تک اور جنوب میں گنگا سے لے کر دریائے نیل اور بحیرہ روم تک کے علاقے کو اپنا مطیع بنایا۔ وہ ستائیس ممالک اور نو مختلف حکمران خاندانوں کا بادشاہ تھا۔

مورخین متفق ہیں کہ وہ قابلیت، ذہانت اور شجاعت کا پیکر تھا جس کے طفیل اس نے اتنی وسیع سلطنت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ایک مفکر، سیاست داِن، مدبر حکمران تھا۔ اس نے جو آئین و قوانین بنائے، فوج کا جو انتظام اور سلطنت کا مالی نظام جس طرح اس نے مرتب کیا، رفاہ عامہ کے جو کام اس نے کئے وہ کسی اور حکمران نے مشکل سے ہی سرانجام دیئے ہوں گے۔

تیمور رعایا پر نہیں اپنی رعایا کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے سپاہی اس کے لئے ہر وقت کٹ مرنے کو تیار رہتے تھے۔ اور اگر وہ کبھی انہیں مال غنیمت لوٹنے سے منع کر دیتا تو وہ قیمتی سے قیمتی مالِ غنیمت کو ہاتھ بھی نہ لگاتے، یہ سب کچھ اس کے خوف سے نہیں ہوتا تھا۔ اس کا سبب کچھ اور بھی تھا۔ وہ اس کا انصاب وعدل کا رویہ تھا۔

یہ انصاف وعدل کا رویہ اس میں کیسے آیا؟ اس کی ایک جھلک ہمیں تزکِ تیموری میں ہی ملتی ہے۔

تیمور کے ایک پیرومرشد تھے وہ ان سے ہدایت کی روشنی لیتا تھا۔ ایک بار تیمور ان کی خدمت میں حاضر ہوا:

تیمور: آپ مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔

مرشد: اے تیمور، خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کر، خدا اور رسول کے باغیوں کو سزا دے اور ان کی جگہ خود سنبھال کر عدل و انصاف سے کام لے اور اے تیمور، ذرا غور سے سن!

تیمور: فرمایئے، پیرومرشد۔

مرشد: کفر سے ملک باقی رہ سکتا ہے مگر ظلم سے نہیں۔

تیمور کے مرشد کی یہ نصیحت آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ جو بھی طاقت اور حکومت کی سیڑھی پر جس جگہ پر بھی ہے، جسے بھی کسی طرح کے اختیارات حاصل ہیں، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ظلم سے اس کی طاقت، اس کی حکومت، اس کا منصب آخر کار باقی نہیں رہ سکے گا۔ اور ناانصافی ظلم کی بدترین صورت ہے۔

☆☆☆☆☆

ملکہ خیزراں کا کرم

مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی ماں اور خلیفہ مہدی کی بیوی، خیزراں چند خواصوں کے ساتھ محل میں بیٹھی تھی، ایک خواجہ سرا آیا۔

خواہ سرا: ایک عورت آپ سے ملنے کیلئے اندر آنا چاہتی ہے۔

خیزراں: حال احوال کیا ہے؟

خواجہ سرا: نہایت خستہ و خراب حالت میں ہے، کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے ہیں، بال بکھرے ہوئے ہیں، لیکن چہرے مہرے سے شریف اور عالی خاندان معلوم ہوتی ہے۔

خیزراں: اسے اندر آنے دو۔

(عورت اندر آتی ہے)

خیزراں: بہن، تم کون ہو؟

عورت: میں بدنصیب آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کی بیوہ مزنہ ہوں۔ گردش ایام نے مجھے اس حال پر پہنچا دیا ہے کہ یہ چیتھڑے بھی مانگے کے ہیں۔ میں اپنی شرافت کی بناء پر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتی۔ لیکن میرا حال فقیروں سے بدتر ہے۔

زینب: (خیزراں کی ایک خواص) اے مزنہ، کیا تم وہ دن بھول گئی جب ہم تمہارے پاس مقتول ابراہیم کی لاش مانگنے آئے تھے اور تم نے ہمیں سخت سست کہہ کے نکلوا دیا تھا اور کہا تھا کہ مردوں کے معاملات میں عورتوں کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ اے مزنہ...... تم سے اچھا سلوک تو تمہارے میاں مروان بن محمد نے کیا تھا کہ لاش ہمارے حوالے کر دی تھی اور ہماری مالی امداد بھی کرنا چاہی تھی۔

مزنہ: زینب، خدا کی قسم میری یہ حالت اسی رویے کا نتیجہ ہے، کیا تم اس رویے کو اچھا سمجھتی ہو کہ جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا۔ اگر ایسا نہیں سمجھتیں اور یقیناً نہیں سمجھتی ہو گی تو پھر تم اپنی مالکہ کو وہ تکلیف دہ بات کیوں یاد دلاتی ہو؟ تمہیں تو یہ چاہیے تھا کہ انہیں نیکی اور بھلائی کی ترغیب دیتیں اور برائی کے بدلے برائی کرنے سے روکتیں۔

یہ کہہ کر مزنہ روتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور واپس جانے کیلئے مڑی۔ خیزراں کو اس کے حال پر بہت ترس آیا۔ اس نے ایک خادمہ کو اشارہ کیا کہ مزنہ کو روکے، کپڑے بدلوائے اور کھانا کھلائے۔ رات کو جب مہدی دربار خلافت سے فارغ ہو کر اندر آیا تو اس نے بتایا۔

خیزراں: آج مروان بن محمد کی بیوہ نہایت خستہ خراب حالت میں محل میں آئی تھی۔

مہدی: کون مزنہ؟

خیزراں: ہاں، وہی مزنہ۔

مہدی: پھر؟

خیزراں: مزنہ کی حالت دیکھ کر میں تو سناٹے میں آ گئی۔ لیکن اپنی زینب سے صبر نہ ہوا۔ اس نے مزنہ کو وہ وقت یاد دلایا جب ہم اپنے مقتول بزرگ امام ابراہیم کی لاش مانگنے اس کے پاس گئے تھے۔ اور اس خیال سے کہ وہ عورت ہے، عورت کے دکھ کو سمجھ کر مروان سے ہماری سفارش کرے گی، اس نے الٹا ہمیں دھتکار دیا تھا، زینب نے اسے خوب سنائیں۔

مہدی: پھر کیا ہوا؟

خیزراں: وہ رو پڑی۔ اور جانے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن میرا دل نہ مانا، میں نے ایک کنیز کو اشارہ کیا، وہ اسے کمرے میں لے جائے، نہا دھلا کر کپڑے پہنائے اور خاطر تواضع کرے۔

مہدی: بیگم، تم نے بہت اچھا کیا جو مزنہ کے معاملے میں خدا ترسی سے کام لیا۔ خدا کی قسم اگر تم اس سے بدسلوکی کرتیں تو میں تم سے کبھی بات نہ کرتا۔

اس کے بعد مہدی نے ایک کنیز کے ذریعے سے مزنہ کے پاس سلام کے بعد یہ پیغام بھیجا، اے میرے چچا کی بیٹی ایسی حالت میں اگر تمہارے پاس میرا آنا تمہیں رنجیدہ اور غمزدہ نہ کر دیتا تو میں خود آتا۔ اس وقت میرے پاس تمہاری تمام بہنیں جمع ہیں، اگر تم مناسب سمجھو تو یہاں آؤ۔ چنانچہ جب مزنہ اس حسن سلوک سے متاثر ہو کر مہدی کے محل میں آئی تو مہدی نے اسے بہت عزت سے اپنے پاس جگہ دی۔ اور دیر تک امویوں کی تباہی و بربادی پر ہمدردانہ گفتگو کرتا رہا، اور کہا، اگر میں تمہارے خاندان میں شادی کرنا پسند کرتا تو ضرور تم سے کر لیتا لیکن میرے لئے اب ایسا کرنا مشکل ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ اب تم مجھ سے پردہ کرو اور اپنی عباسی بہنوں کے ساتھ محل میں رہو۔ جو مرتبہ ان کا ہے وہی تمہارا ہوگا۔ وہی عزت اور آسائشیں تمہیں میسر ہوں گی۔

اور مہدی نے جو کہا تھا اسے نبھایا۔ مزنہ نے عباسیوں کے محل میں بڑی عزت اور آرام سے زندگی بسر کی۔ اسے عباسی خواتین کے برابر جاگیر بھی دی گئی اور ادب و احترام کی جگہ بھی۔ مزنہ نے خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں انتقال کیا۔

احسان کرنا یوں بھی نیکی کی بات ہے۔ لیکن اپنے دشمنوں کی گزشتہ دشمنی کو معاف کرنا اور ان کے ساتھ احسان کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔

☆☆☆☆☆

فتنوں کی جڑ

حضرت سعیدؓ بن عامر بڑے پائے کے صحابی تھے۔ خیبر اور اس کے بعد کے ہر غزوہ میں

شریک رہے۔ جنگ یرموک میں داد شجاعت دی۔ حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ نے انہیں اپنے عہد خلافت میں حمص کا امیر مقرر کیا۔ وہ اس تقرر سے خوش نہ تھے۔ حضرت فاروقؓ کے اصرار پر اس ذمہ داری کو قبول کیا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے ایک دفعہ ان سے پوچھا۔

"سعیدؓ، شام کے لوگ تمہارے شیدائی کیوں ہیں؟"

حضرت سعیدؓ بن عامر نے جواب دیا

"میں گلہ بانی کے ساتھ گلہ کی غم خواری بھی کرتا ہوں۔"

حضرت سعیدؓ کی گلہ بانی اور گلہ کی غم خواری کی شان کیا تھی؟ انہیں جو تنخواہ ملتی اس میں سے چند درہم کھانے پینے کے سامان پر صرف کرتے اور باقی سب رقم راہ خدا میں لٹا دیتے۔ جب بیوی پوچھتیں۔ "تنخواہ کی باقی رقم کہاں ہے؟ تو کہہ دیتے۔ "قرض دے دیا ہے۔"

قرض دینے سے حضرت سعیدؓ کی مراد یہ ہوتی تھی کہ رقم راہ خدا میں خرچ کر ڈالی ہے۔ قرآن حکیم میں ایسے خرچ کو قرض حسنہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک دفعہ حمص کے کچھ لوگ وفد کی شکل میں حضرت سعیدؓ کے پاس گئے اور کہا:

"اے امیر، آپ کو ہم نے ہمیشہ نادار اور مفلس پایا ہے۔ آخر آپ کے کنبے کا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔ اپنے ہاتھ کو اتنا کشادہ نہ رکھیں۔"

حضرت نے سعیدؓ نے جواب دیا۔

یہ میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے تو فقر و غنا پسند ہے۔ کیونکہ میں نے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ فقرائے مومنین دوسرے لوگوں سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

اور واقعی حضرت زہد و قناعت کی یہ شان تھی کہ عام غرباء اور امیر حمص میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔

ایک بار حضرت عمر فاروق ؓ شام کے دورے پر تشریف لے گئے تو حمص پہنچ کر آپ نے وہاں کے سربرآوردہ لوگوں سے کہا کہ حمص کے فقراء اور مساکین کی ایک فہرست تیار کر کے لاؤ

تا کہ ان کی گزر اوقات کا انتظام کیا جائے۔ جب فہرست تیار ہو کر حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے آئی تو سر فہرست سعیدؓ بن عامر کا نام درج تھا۔

آپ نے پوچھا

''یہ کون ہیں؟''

جواب ملا۔ ''سعیدؓ بن عامر ہمارے امیر ہیں۔''

امیرالمومنین نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ان کو جو تنخواہ ملتی ہے، اس کا کیا کرتے ہیں؟''

لوگوں نے جواب دیا۔

''وہ دوسرے حاجت مندوں پر صرف کر دیتے ہیں۔''

یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ آبدیدہ ہو گئے۔ پھر اپنے خط کے ساتھ انہیں ایک ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا کہ انہیں آپ اپنی ضرورتوں پر خرچ کریں۔

جب قاصد نے یہ رقم سعیدؓ بن عامر کو دی تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا، یا اللہ!

بیوی: خیر تو ہے؟ کیا امیرالمومنین نے وفات پائی؟

سعیدؓ بن عامر: اس سے بھی بڑا واقعہ ہے۔

بیوی: کیا قیامت کی کوئی نشانی نظر آئی؟

سعیدؓ بن عامر: اس سے بھی اہم واقعہ پیش آیا ہے۔

بیوی: آخر کچھ بتائیے کہ معاملہ کیا ہے؟

سعیدؓ بن عامر: یہ دیکھو، دنیا فتنوں کو لے کر میرے گھر میں داخل ہو گئی ہے۔

بیوی: آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اس کے تدارک کی کوئی تدبیر سوچیں۔

اور حضرت سعیدؓ نے اس کا تدارک یہ کیا کہ ہزار دینار گھوڑے کے توبڑے میں ڈال دیئے اور خود نماز کیلئے کھڑے ہو گئے۔ صبح ہوئی تو دیکھا اسلامی لشکر گھر کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ آپ نے دینار توبڑے سے نکال کر مجاہدین میں تقسیم کر دیئے۔

ایک اور موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے پھر ایک ہزار دینار حضرت سعیدؓ بن عامر کے پاس بھیجے اور پیغام دیا کہ انہیں اپنے ذاتی تصرف میں لائیں۔ اس موقع پر حضرت سعیدؓ اور ان کی بیوی میں گفتگو ہوئی۔

بیوی: ہمارے پاس کوئی خادم نہیں ہے، آپ کو اور مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، اس رقم سے ہم ایک خادم کیوں نہ حاصل کر لیں؟

حضرت سعیدؓ: کیا اس سے بہتر یہ نہیں کہ یہ دینار ان لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں جو ہم سے بھی زیادہ محتاج اور نادار ہیں؟

بیوی: ہاں۔ یہ یقیناً بہتر ہے، آپ بجا کہتے ہیں۔

اور حضرت سعیدؓ بن عامر نے اپنی نیک بی بی کی رضا مندی سے یہ رقم مستحقین میں صدقہ کر دی۔

حضرت سعیدؓ بن عامر کا ایک اور واقعہ بھی تاریخ میں مذکور ہے، وہ بھی اس قابل ہے کہ اسے بار بار دہرایا جائے۔

ایک موقع پر اہل حمص نے حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حضرت سعیدؓ بن عامر کے خلاف اپنی شکائتیں پیش کیں۔

''جب تک کافی دن نہیں نکل آتا، سعیدؓ گھر سے باہر نہیں نکلتے۔''

''رات کو کوئی آواز دیتا ہے تو جواب نہیں دیتے''۔

''مہینے میں ایک دن گھر کے اندر رہتے ہیں اور بالکل باہر نہیں نکلتے۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے تحقیق کیلئے انہیں مدینہ طلب کیا اور شکایات کی فہرست ان کے سامنے

رکھ دی۔ ان کا جواب یہ تھا۔

حضرت سعیدؓ: امیر المومنین، خدا کی قسم میں ان چیزوں کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اب آپ پوچھتے ہیں تو حقیقت حال کا اظہار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

میں علی الصبح اس لئے باہر نہیں نکلتا کہ میرے پاس کوئی خادم نہیں، میں اپنی اہلیہ کے ساتھ مل کر گھر کا کام کرتا ہوں۔

رات کو اس لئے جواب نہیں دیتا کہ رات کا وقت میں نے اپنے رب کے حضور حضوری کے لئے مختص کیا ہوا ہے۔

مہینہ میں ایک دن اس لئے باہر نہیں نکلتا کہ میرے پاس کپڑوں کا صرف ایک ہی جوڑا ہے۔ مہینہ میں ایک بار اس کو دھوتا ہوں، سکھاتا ہوں اور پھر وہی پہنتا ہوں۔ اس طرح دن کا بڑا حصہ گزر جاتا ہے اور اس دوران میں لوگوں سے مل نہیں سکتا۔

حضرت سعیدؓ بن عامر کے جوابات سن کر حضرت عمر فاروقؓ بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

''تمہارے بارے میں میرا جو خیال تھا وہ صحیح نکلا، حمص واپس جاؤ اور اسی طرح خلقِ خدا کی خدمت کرتے رہو''۔

یہ سن کر حضرت سعیدؓ نے درخواست کی کہ:

''امیر المومنین، مجھے اب بار امامت سے سبکدوش کر دیجئے۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا،

''ہرگز نہیں، واللہ تمہیں ضرور حمص واپس جانا ہوگا، تمہارے جیسا گلہ بان ان لوگوں کو میسر نہیں آئے گا۔''

☆☆☆☆☆

ایک ظالم کے سامنے

ایک حدیث ہے کہ ظالم حاکم کے سامنے سچی بات کہنا جہاد ہے۔ دنیا میں اچھے برے آدمی ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ حجاج بن یوسف ایسا ہی برا آدمی گزرا ہے، بڑا ظالم تھا، سنگ دل اور جابر۔ جو کوئی ذرا بھی اختلاف کرتا اسے مٹا کر ہی دم لیتا۔ اس کے زمانے میں ایک بڑے عالم، فاضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے سعید بن جبیرؒ، ایمان کے کھرے اور بات کے پکے۔ سچی بات بڑے سے بڑے حاکم کے منہ پر کہہ دیتے تھے۔ وہ جو مومن کی شان ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، وہ ان میں بدرجہ کمال موجود تھی۔ پھر ان کا نباہ حجاج بن یوسف ثقفی جیسے خودسر اور ظالم سے کیسے ہوتا۔ اختلاف ہوا۔ اور کھل کر ہوا اور ظالم کی بن آئی۔

جب سعید بن جبیرؒ کو گرفتار کر کے حجاج کے سامنے پیش کیا گیا تو سب کو معلوم تھا کہ سعیدؒ کا انجام کیا ہوگا۔ جب حجاج نے جلاد کو بلایا تو اس کی نیت کے کھوٹ کا ثبوت بھی مل گیا۔ سعید کے قتل سے پہلے حجاج اور سعید میں جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔

حجاج: (طنزاً) تمہارا نام کیا ہے؟

سعید: سعید بن جبیر۔

حجاج: تم شقی بن کسیر ہو۔

سعید: میری ماں میرا نام تجھ سے بہتر جانتی تھیں۔

حجاج: تم بھی بد بخت اور تمہاری ماں بھی۔

سعید: غیب کا علم تیرے پاس نہیں۔ یہ کسی دوسری ذات کے پاس ہے۔

حجاج: میں تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے سپرد کروں گا۔

سعید: اگر میں یہ جانتا کہ ایسا کرنا تیرے بس میں ہے تو تجھے عبادت کے لائق سمجھتا۔

حجاج: میرے متعلق کیا کہتے ہو؟

سعید: تمہارا قول و فعل کتاب الٰہی کے خلاف ہے، تم اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کیلئے سفاکیاں کرتے ہو۔ یہ مظالم تمہیں برباد کر رہے ہیں، روز قیامت تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔

حجاج: تم پر ہلاکت ہو۔

سعید: ہلاکت اس شخص پر ہے جس کو جنت سے الگ کر کے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

حجاج: کیا میں نے تمہیں ایک لاکھ کی رقم خیرات کرنے کیلئے نہیں دی تھی؟

سعید: بے شک دی تھی۔

حجاج: پھر تم میری مخالفت پر کیوں کمر بستہ ہوئے۔

سعید: تمہارے مظالم اور بداعمالیوں نے مجھے مجبور کیا۔

حجاج: خدا کی قسم میں تمہیں قتل کئے بغیر یہاں سے نہ ہٹوں گا۔

سعید: میں صرف جان سے جاؤں گا، تمہاری عاقبت خراب ہوگی۔

حجاج: بتاؤ، تم کس طریقے سے قتل ہونا پسند کرو گے؟

سعید: تو خود ہی پسند کر، رب اکبر کی قسم، جس طرح تو مجھ کو قتل کرے گا، اسی طرح خدا تجھے آخرت میں قتل کرے گا۔

حجاج: کیا تمہارا جی چاہتا ہے کہ تمہیں معافی مل جائے۔

سعید: معافی دینا اللہ کے اختیار میں ہے، رہا تو، تو یہ تیری قدرت سے باہر ہے کہ کسی کو بری کرے یا کسی کا عذر قبول کرے۔

حجاج: میں تمہیں ضرور قتل کروں گا۔

سعید: ہر شخص کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اگر میرا آخری وقت آ گیا ہے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا، اگر ابھی وقت نہیں تو کوئی مجھے مار نہیں سکتا۔

اس کے بعد حجاج نے طیش میں آ کر حضرت سعید بن جبیر کے قتل کا حکم دے دیا۔ جب جلاد سعید کو سوئے مقتل لے چلا تو سعید کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ وہ یہ دیکھ کر اور بھڑکا اور انہیں دوبارہ سامنے پیش کرنے کا حکم دیا۔ سعید اسی طرح سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

حجاج: تم ہنسے کیوں؟

سعید: خدا کے مقابلے میں تیری جرات اور تیرے لئے خدا کا عفو و حلم دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔

حجاج: (جلاد سے) اسے میرے سامنے قتل کرو۔

جب جلاد حجاج کے حکم کی تعمیل کیلئے آگے بڑھا تو سعیدؒ نے بلند آواز سے دعا مانگی۔

بار الہا! میرے قتل کے بعد اس ظالم کو کسی کے قتل پر قادر نہ کرنا، پھر کلمہ شہادت پڑھا۔ ابھی کلمہ شہادت زبان پر جاری تھا کہ جلاد کی تلوار گردن پر پڑی۔

شہادت کے بعد حضرت سعید بن جبیر کے جسم سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ جسم سے اتنا خون بہا کہ حد نہیں۔ حجاج بڑا ظالم تھا۔ اس نے ہزاروں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اتنا خون بہتے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے طبیب خاص سے پوچھا،

''اس مقتول کے جسم سے اتنا خون کیوں بہا''؟

طبیب نے جواب دیا۔

''دوسرے لوگوں کا خون قتل کا حکم سنتے ہی خشک ہو جاتا ہے لیکن سعید کی طبیعت بالکل مطمئن تھی اور قتل کا خوف ان کے دل میں نہ تھا، اس لئے انکے جسم سے خلاف معمول زیادہ خون نکلا''۔

یہ المناک واقعہ 94ھ کا ہے۔ حضرت سعید کی دعا قبول ہوئی۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف

خود کر بناک امراض میں مبتلا ہو کر سال بھر کے اندر اندر مر گیا۔ اور کسی کے قتل پر قادر نہ ہو سکا۔

☆☆☆☆☆

ایک تاجدار ایک درویش کے در پر

شہر خرقان میں ایک درویش خدا مست رہتے تھے۔ نام ان کا ابوالحسن تھا۔ جب محمود غزنوی نے ان کے فضل و کمال، زہد و اتقاء کا شہرہ سنا تو ملاقات کا مشتاق ہوا۔ شیخ کو پیغام بھیجا کہ:

آپ سے نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دربار میں تشریف لانے کی زحمت فرمائیں۔

شیخ نے جواب بھیج دیا۔

''درویش کا دربار میں کیا کام''؟

سلطان سمجھ گیا کہ شیخ ملنا نہیں چاہتے۔ شیخ کی بے نیازی کی وجہ سے وہ ان کا مزید گرویدہ ہو گیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد کسی باغی کو سزا دینے کا بہانہ کر کے ایک بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ خرقان پہنچا۔ شہر کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ اور شیخ کو بلوانے کیلئے قاصد بھیجا۔

قاصد: یا شیخ، سلطان خود خرقان آئے ہوئے ہیں۔ اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

شیخ: میں پہلے بھی معذرت کر چکا ہوں۔ اب بھی وہی جواب ہے کہ درویش کا کسی سلطان کے دربار میں کیا کام۔

قاصد: سلطان نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر آپ آنے میں لیت و لعل کریں تو میں آپ کو قرآن حکیم کی یہ آیت یاد دلاؤں۔

''اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور جو تم میں اولی الامر یعنی حاکم ہو اس کی اطاعت کرو۔''

شیخ: جاؤ محمود سے جا کر کہو، بے شک قرآن کا فرمان صحیح ہے لیکن میں ابھی اطاعت اللہ میں اس طرح گھرا ہوا ہوں کہ اطاعت رسول تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔ اور

اس پر ندامت ہے، پھر اولی الامر تو آخری چیز ہے، اس کا ذکر ہی کیا۔

قاصد الٹے پاؤں واپس گیا۔ اور شیخ کا جواب سلطان کے گوش گزار کیا۔ سلطان محمود یہ جواب سن کر آبدیدہ ہوا۔ اور خود ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ شیخ نے بیٹھے بیٹھے سلام کا جواب دیا۔ پھر یہ گفتگو ہوئی۔

محمود: حضرت، مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے۔

شیخ: چار باتوں کا خیال رکھو، خدا تم پر رحم فرمائے گا۔

جو باتیں شرع میں منع ہیں، ان سے پرہیز کرو۔

نماز باجماعت کا اہتمام کرو۔

سخاوت کو اپنا شعار بناؤ۔

لوگوں کے ساتھ احسان کرو اور شفقت سے پیش آؤ۔

محمود: حضرت، دعا فرمائیے۔

شیخ: الھم اخضر المومنین والمومنات

محمود: کچھ خاص میرے لئے بھی دعا کریں۔

شیخ: اللہ تمہاری عاقبت کو محمود کرے۔

محمود نے اشرفیوں کی ایک تھیلی شیخ کو پیش کی۔ شیخ نے جواب میں جو کی ایک روٹی دی اور کہا، اسے کھاؤ۔ محمود نے ایک لقمہ توڑ کے منہ میں رکھا لیکن وہ لقمہ حلق سے نیچے نہ اتر سکا۔

شیخ: شاید حلق میں اٹکتا ہے؟

محمود: جی ہاں۔

شیخ: کیا چاہتے ہو کہ اشرفیوں کا سونا بھی میرے حلق میں اٹک جائے؟ اس کو اٹھا لو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

محمود: حضرت، کچھ تو قبول فرمایئے۔

شیخ: اصرار نہ کرو، میرے لئے یہ حرام ہے۔

محمود: اگر میرا اندرانہ قبول نہیں تو کچھ تبرک عنایت فرمائیں۔

شیخ: اور شیخ نے اپنا ایک کرتا محمود کو دیا۔ جب محمود رخصت ہونے لگا تو شیخ ابوالحسن تعظیماً کھڑے ہو گئے۔

محمود: حضرت، جب میں حاضر ہوا تھا تو آپ نے میری طرف ذرا بھی توجہ نہ فرمائی تھی، اب یہ تعظیم و تکریم کیسی؟

شیخ: جب تم یہاں آئے تھے تو تم میں شاہانہ جاہ و جلال کی خو بو تھی۔ اور اس فقیر کی آزمائش بھی مقصود تھی۔ لہٰذا فقیر نے تمہاری پرواہ نہ کی۔ لیکن اس وقت عاجزی و انکساری لے کر جا رہے ہو، لہٰذا مجھے تمہارے عجز و انکسار کی تعظیم کرنا پڑی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے عجز و انکسار کو پسند فرمایا ہے۔ اور تکبر و غرور کو ناپسند کیا ہے۔

یہ سن کر محمود اور زیادہ متاثر ہوا، اور بڑے ادب و انکسار کے ساتھ شیخ سے رخصت ہوا۔

☆☆☆☆☆

بازار میں وہی مال آتا ہے جو بکتا ہے

حاکم وقت کے سامنے کھری بات کہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو سَر خلوص سے معبود حقیقی کے سامنے جھک جائے وہ پھر کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا۔ ایک بار حضرت خالد بن عبدالرحمٰن بغداد آئے تو ابو جعفر منصور عباسی نے ان کو دربار میں طلب کیا۔

منصور: آپ نے بنوامیہ کا دورِ حکومت بھی دیکھا ہے، بتائیے کہ میری اور ان کی حکومت میں کیا فرق ہے؟

حضرت خالد: کوئی نہیں۔ بنوامیہ کی سلطنت میں کوئی ظلم ایسا نہ تھا جسے میں نے تمہارے عہد حکومت میں نہ دیکھا ہو۔

منصور: دوران سفر آپ نے ہمارے صوبوں کی حالت دیکھی؟ ہمارے کارندوں اور افسروں کا کیا حال ہے؟

حضرت خالد: میں نے تمہارے افسر دیکھے ہیں، ان کے مظالم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

منصور: ہمیں اچھے افسر نہیں ملتے، کیا کریں؟

حضرت خالد: حضرت عمر بن عبدالعزیز کہا کرتے تھے کہ حاکم ایک بازار ہے، جس میں وہی مال آتا ہے جو اس میں چلتا ہے۔ اگر حاکم اچھا ہے تو مقربین اس کے پاس اچھے لوگوں کو لاتے ہیں۔ اور اگر وہ برا ہوتا ہے تو لوگ اس کی خدمت میں برے لوگوں کو پیش کرتے ہیں۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

☆☆☆☆☆

خواہ جان جائے اس مال کو ہاتھ نہ لگاؤں گا

ایک بار مشہور عباسی خلیفہ منصور نے دوسرے علماء کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کو بھی بلایا اور کہا۔

خلیفہ منصور: ''یہ حکومت جو اللہ تعالیٰ نے اس امت میں مجھے عطا کی ہے، اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کیا میں اس کا اہل ہوں''؟

امام ابوحنیفہ: اگر آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے ہم لوگوں کو اللہ کی خاطر نہیں بلایا ہے۔ بلکہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ڈر سے آپ کی منشا کے مطابق بات کہیں۔ تا کہ عام لوگوں کے سامنے اس کی تشہیر کر سکیں۔ کیا آپ میری اصل رائے سن سکیں گے؟

خلیفہ منصور: کہئے۔

امام ابوحنیفہ: حقیقت یہ ہے کہ آپ اس طرح خلیفہ بنے ہیں کہ آپ کی خلافت پر اہل الرائے میں سے دو آدمیوں کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔

تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ جب یہ کہہ کر امام ابوحنیفہؒ گھر چلے آئے تو منصور نے اپنے وزیر ربیع کو درہموں کی تھیلی دے کر ابوحنیفہ کے پاس بھیجا اور کہا۔ یہ ابوحنیفہ کو دینا، اگر وہ قبول کر لیں تو ان کی گردن کاٹ لانا اور اگر قبول نہ کریں تو ان سے کوئی تعرض نہ کرنا۔

جب ربیع ابوحنیفہ کے پاس درہم کی تھیلی لے کر پہنچا تو امام ابوحنیفہ نے کہا، خواہ میری گردن ہی کیوں نہ ماردی جائے میں اس مال کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

یہ جواب سن کر ربیع الٹے پاؤں منصور کے پاس پہنچا اور امام سے اپنی ملاقات کی روداد کہہ سنائی۔ منصور یہ سن کر کچھ دیر چپ رہا اور پھر بولا۔

تم یہ تھیلی ابن ابی زئب کے پاس لے جاؤ، ان کے علم کا بھی بڑا شہرہ ہے منصور کا وزیر ربیع وہ تھیلی لے کر ابن ابی زئب کے ہاں گیا۔ ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

ربیع: حضرت، مبارک ہو، میں آپ کی خدمت میں خلیفہ کا ایک پیغام لایا ہوں۔

ابن ابی زئب: کیا پیغام ہے؟

ربیع: یہ ایک نذر ہے، خلیفہ چاہتے ہیں کہ آپ قبول فرمائیں۔

ابن ابی زئب: میں یہ درہم نہیں لے سکتا۔

ربیع: کیوں؟ خلیفہ کے عطیے کو آپ کیوں ٹھکراتے ہیں؟

ابن ابی زئب: میں اس کو خود منصور کیلئے بھی حلال نہیں سمجھتا، اپنے لئے کیسے حلال سمجھوں؟

☆☆☆☆☆

ہدیہ قبول کرنے میں کیا قباحت ہے؟

ہدیہ یا تحفہ قبول کرنا جائز ہے، ناجائز نہیں، لیکن جن کا قلب تقویٰ کی روشنی سے روشن ہو وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہدیہ کون دے رہا ہے اور کیوں دے رہا ہے۔ ایک بار خلیفہ منصور اور امام ابوحنیفہؒ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

خلیفہ منصور: آپ کو میرے ہدیے پہنچتے ہوں گے۔

امام ابوحنیفہ: پہنچے تو ضرور ہیں۔

خلیفہ منصور: آپ ان نذرانوں اور تحفوں کو قبول کیوں نہیں کرتے؟

امام ابوحنیفہ: قبول نہ کرنا بے وجہ نہیں۔

خلیفہ منصور: کیا ہدیہ دینا اور لینا جائز نہیں؟

ابوحنیفہ: میں نے کب کہا کہ جائز نہیں۔

خلیفہ منصور: تو پھر؟

امام ابوحنیفہ: آپ اپنے مال میں سے مجھے کچھ دیتے تو میں ضرور قبول کر لیتا۔ میں نہ ملک کے دفاع کیلئے لڑنے والا ہوں کہ ایک سپاہی کا حصہ پاؤں نہ شہیدوں کی اولاد میں سے ہوں کہ ان کا حصہ مجھے ملے اور نہ میں فقراء میں سے ہوں کہ جو کچھ انہیں ملنا چاہیے وہ مجھے ملے۔

☆☆☆☆☆

دو قلم دانوں کا قصہ

مولانا عنایت الٰہی، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے پرنسپل تھے، تمام انتظامی امور ان ہی کے سپرد تھے دن رات دفتری کاموں میں لگے رہتے تھے، گھر بھی جانے کی فرصت کم ہی ملتی تھی۔ ایک روز ایک ملاقاتی سے یہ گفتگو ہوئی۔

ملاقاتی: مولانا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے اپنے دائیں بائیں دو قلم دان کیوں رکھے ہوئے ہیں؟

مولانا: یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

ملاقاتی: کوئی خاص بات نہیں، تھوڑا سا تجسّس ہے، ابھی آپ نے ایک رقعہ لکھا تو اس قلم دان کو استعمال کیا، اس سے پہلے دوسرے سے لکھ رہے تھے۔

مولانا: آپ اصرار کرتے ہیں تو بتاتا ہوں۔ وہ قلم دان مدرسے کا ہے۔ مدرسے کا کام اس سے کرتا ہوں۔ یہ قلم دان میرا اپنا ہے، اسی میں دو چار کاغذ پڑے ہیں۔ اپنے گھر کوئی رقعہ وغیرہ لکھنا ہو یا اپنا کوئی کام ہو تو میں یہ قلم دان استعمال کرتا ہوں۔

اس واقعہ کو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے حوالے سے 30 نومبر 1980ء کے اخبار جنگ میں نقل کیا گیا۔ اس واقعہ سے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دو چراغوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب اراکین سلطنت آپ کے پاس مشاورت کو جمع ہوتے تو آپ بیت المال کا چراغ جلائے رکھتے۔ جب دربار برخاست ہوتا تو اس کو بجھا دیتے اور اپنا چراغ جلا لیتے۔ اور یہ چراغ بھی کیا تھا، مٹی کا دیا تھا جو تین پتلی لکڑیوں کو کھڑا کر کے ان پر رکھ دیا گیا تھا۔

قلم کی سیاہی

جسٹس محمد شہاب الدین پرانے آئی سی ایس افسر تھے۔ پاکستان بننے پر انہوں نے اپنی خدمات حکومت پاکستان کو منتقل کر دی تھیں۔ وہ اپنی اصول پرستی اور دیانت داری کیلئے مشہور تھے۔ 21 دسمبر 1954ء کو انہوں نے مشرقی پاکستان کے گورنر کا منصب سنبھالا۔ کچھ عرصے کے بعد جب محمد علی بوگرہ وزیراعظم پاکستان بنے تو انہوں نے مشرقی پاکستان سے متعلق ایک بیان ان سے مشورہ کئے بغیر داغ دیا۔ اس غیر آئینی حرکت پر جسٹس شہاب الدین نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔

وزیراعظم نے معذرت کی اور ان سے استعفیٰ واپس لینے کو کہا۔ لیکن انہوں نے استعفیٰ واپس نہیں لیا۔ چنانچہ جب وہ گورنر ہاؤس کو خیر باد کہنے لگے تو اپنے دفتر گئے اور اپنی جیب سے قلم نکال کر اس کی ساری سیاہی دفتر کی دوات میں انڈیل دی۔ اس وقت ان کے اے ڈی سی میجر ایس جی جیلانی پاس کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔

میجر جیلانی: سر، یہ سیاہی آپ نے کیوں انڈیل دی؟

شہاب الدین: حکومت کی سیاہی حکومت کے کام پر صرف ہو سکتی تھی۔ اب چونکہ میں گورنر نہیں رہا، اس سیاہی کو استعمال کرنے کا جواز بھی باقی نہیں رہا۔

☆☆☆☆☆

مدرسے کا قالین

سہارنپور میں ایک مشہور و معروف دینی مدرسہ تھا، مظاہر العلوم۔ اس کے استاد مولانا خلیل احمد ایک روز حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کے ایک عزیز ان سے ملاقات کیلئے آئے۔ لیکن درس ختم ہونے تک مولانا نے ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ جب درس ختم ہوا تو وہ اٹھ کر ملاقاتی کے پاس آنے لگے۔

ملاقاتی: حضرت، کیوں زحمت فرماتے ہیں۔

مولانا: اس میں زحمت کی کیا بات ہے، میں آپ کے پاس آ کر آپ سے بات کرلوں گا۔

ملاقاتی: یہاں فرش ٹھنڈا ہے، آپ کو تکلیف ہوگی۔ آپ وہیں قالین پر تشریف رکھیں۔

مولانا: بھائی، یہ قالین درس دینے کیلئے ہے، ذاتی استعمال کیلئے نہیں۔

اس واقعہ کے راوی شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مولانا کی تنخواہ ایک عرصہ تک چالیس روپے رہی۔ جب بھی مدرسہ کی انتظامیہ کی طرف سے مولانا کی تنخواہ میں اضافے کی تحریک ہوتی، مولانا کا ایک ہی جواب ہوتا، میری حیثیت سے یہ بھی زائد ہے۔ آخرکار جب ماتحت مدرسوں کی تنخواہیں چالیس تک پہنچ گئیں تو کمیٹی کے ممبروں نے کہا۔

''حضرت، آپ کی وجہ سے دوسرے مدرسوں کی ترقی رک جائے گی۔''

اس دلیل سے لاجواب ہو کر مولانا نے تنخواہ میں اضافہ قبول کیا۔ لیکن اس کے باوجود احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب 1344 ہجری میں مکہ معظّمہ کی طرف ہجرت کی تو اپنا ذاتی کتب خانہ یہ کہہ کر مدرسے کے نام وقف کر دیا کہ نہ معلوم مدرسے کے کتنے حقوق میرے ذمے رہ گئے ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

بیٹا، نمک تم چکھو

کوئی ادارہ بھی ہو اس کے سربراہ کا کردار خاموشی سے اس ادارے کے ہر فرد میں نفوذ کر جاتا ہے۔ مظاہر العلوم کے صدر مدرس کے تقویٰ کے دو ایک واقعات اوپر بیان ہوئے۔ اب اسی مدرسے کے ایک اور مدرس مولانا ظہور الحق کا ایک واقعہ سنیئے۔

مولانا مدرسے کے کھانے پینے کے نگران تھے۔ پڑھنے پڑھانے سے جو وقت بچتا، باورچی خانے میں گزارتے۔ سارا دن بلکہ رات گئے تک وہیں رہتے۔ لیکن کھانے کا نمک تک کسی طالب علم سے چکھواتے تھے، خود نہیں چکھتے تھے، اور جب دیر سویر وقت ملتا تو گھر جا کر کھانا کھا آتے۔ ایک طالب علم نیا نیا آیا تھا، ایک روز اس سے مولانا نے سالن کا نمک چکھنے کو کہا تو اس سے نہ رہا گیا۔

طالب علم: آپ کا حکم ہے تو چکھ لیتا ہوں، ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ یہ تکلف کیوں

کرتے ہیں؟

مولانا: میاں، تکلف کی بات نہیں۔

طالب علم: پھر کیا بات ہے، نمک چکھنے سے کیا ہوتا ہے، کھانا تو آپ یہاں کبھی کھاتے ہی نہیں؟

مولانا: بیٹا، کچھ دنوں کے بعد تم خود سمجھ جاؤ گے کہ میں اتنی احتیاط کیوں کرتا ہوں۔

یہ واقعہ بھی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نے روایت کیا۔

☆☆☆☆☆

منصب قضا؟ نہیں، ہر گز نہیں

کوفہ میں حضرت ابو وائل بن سلمہ ایک مجاہد تھے۔ اموی عہد میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ایک بار جب حجاج بن یوسف کوفہ آیا تو ان کی تعریف سن کر انہیں بلا بھیجا۔

حجاج: آپ کا نام کیا ہے؟

ابو وائل: آپ کو معلوم ہو گا۔ ورنہ مجھے بلاتے کیسے؟

حجاج: اس شہر میں کب آئے؟

ابو وائل: جب اس شہر کے تمام باشندے آئے۔

حجاج: آپ کو کتنا قرآن یاد ہے؟

ابو وائل: اتنا کہ اگر اس پر عمل کروں تو میرے لئے کافی ہو۔

حجاج: میں نے آپ کو کیوں بلایا؟

ابو وائل: مجھے معلوم نہیں۔

حجاج: میں آپ کو کوئی عہدہ دینا چاہتا ہوں۔

ابووائل: کونسا عہدہ؟

حجاج: منصب قضاء

ابووائل: یہ عہدہ ان لوگوں کیلئے ہے جو ذمہ داری کے ساتھ اس کو سرانجام دے سکیں۔ اور میں اس کیلئے قطعاً موزوں نہیں۔

حجاج: نہیں، آپ کو یہ منصب قبول کرنا ہی پڑے گا۔

ابووائل: اگر مجھے اس سے معاف رکھا جائے تو بہتر ہے، اگر اصرار ہوا تو قبول کرلوں گا، مگر میں اپنے دل کی کیفیت ابھی بتا دینا چاہتا ہوں۔

حجاج: فرمائیے۔

ابووائل: میری حالت یہ ہے کہ اب جب کہ میں آپ کا کوئی عہدیدار نہیں تو آپ کے خیال ہی سے میری راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ اور جب عہدیدار ہو جاؤں گا تو کیا حال ہوگا؟

☆☆☆☆☆

ابوحنیفہؒ! زندگی اور موت میں تیری پکڑ سے مجھے کون بچائے؟

ایک بار خلیفہ منصور نے حضرت ابوحنیفہؒ کو بلایا۔

خلیفہ منصور: میں نے آپ کو بار ہا کہا ہے کہ آپ میرے عہد حکومت میں قضا کا منصب قبول کریں۔

ابوحنیفہ: میں بعض وجوہ کی بناء پر معذرت کرتا رہا ہوں، اب بھی وہی مجبوری ہے۔

خلیفہ منصور: میں یہ عذر نہیں مانتا، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ

بناؤں، اس بار میں کوئی عذر نہیں سنوں گا۔

ابوحنیفہ: قضاء کے لئے وہی شخص موزوں ہوسکتا ہے جو اتنی جان رکھتا ہو کہ آپ پر اور آپ کے شاہزادوں اور سپہ سالاروں پر قانون نافذ کر سکے، مجھ میں اتنی جان نہیں ہے۔

خلیفہ منصور: یہ پھر وہی دامن بچانے کا حیلہ ہے، میں آپ سے کہہ چکا ہوں، میں اس بار ہرگز عذر نہیں سنوں گا، آپ کو قاضی القضاۃ بننا پڑے گا۔

ابوحنیفہ: خدا کی قسم، اگر میں رضامندی سے بھی یہ عہدہ قبول کرلوں تو آپ کے بھروسے کے قابل نہیں ہوں، کجا کہ ناراضگی کے ساتھ مجبوراً قبول کروں۔ اگر کسی معاملہ میں میرا فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور پھر آپ نے مجھے دھمکی دی کہ میں تجھے فرات میں غرق کردوں گا، ورنہ اپنا فیصلہ بدل دے، میں غرق ہوجانا پسند کروں گا مگر فیصلہ نہ بدلوں گا۔ پھر، آپ کے بہت سے اہل دربار بھی ہیں جنہیں ایسا قاضی چاہیے جو آپ کی خاطر ان کا بھی لحاظ کرے۔

امام ابوحنیفہ کو قاضی القضاۃ بننا تھا، نہ بنے۔ ان کے مسلسل انکار پر منصور طیش میں آ گیا۔ ان کو تیس کوڑے لگانے کا حکم دیا، کوڑوں سے ان کا سارا بدن لہولہان ہوگیا، مگر نہیں ہاں میں نہ بدلی۔

خلیفہ منصور کے چچا الصمد بن علی کو خبر ہوئی تو انہوں نے منصور کو سخت ملامت کی۔

''یہ تم نے کیا کیا؟ یہ شخص عراق کا فقیہ ہے بلکہ تمام اہل مشرق کا فقیہ ہے''۔

منصور نے نادم ہوکر فی تازیانہ ایک ہزار درہم کے حساب سے تیس ہزار درہم امام کو بھجوائے۔

مہتمم خزانہ: امیر المومنین نے یہ تیس ہزار درہم آپ کو بھجوائے ہیں۔

ابوحنیفہ: کیوں؟

مہتمم: ہدیہ کے طور پر۔

ابوحنیفہ: میں ہدیہ قبول نہیں کرسکتا۔

مہتمم: اگر آپ ہدیہ رد کریں گے تو خلیفہ کی سبکی ہوگی۔

ابوحنیفہ: ہوا کرے، میں نے تو انہیں ہدیہ بھیجنے کو نہیں کہا تھا۔

مہتمم: اگر آپ اپنے لئے نہیں لیتے تو اس رقم کو لے کر خیرات کر دیجئے۔

ابوحنیفہ: کیا ان کے پاس کوئی مال حلال بھی ہے؟

جب یہ بات منصور تک پہنچی تو وہ انتقام پر اتر آیا۔ پہلے کوڑے لگوائے۔ پھر قید میں ڈال کر ہر طرح کی اذیتیں دیں۔ آخر کار ایک مکان میں نظر بند کر دیا جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ انہیں زہر دیا گیا تھا۔ جب حضرت امام کا آخر وقت آن پہنچا تو آپ نے جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ بغداد کے اس حصے میں انہیں دفن کیا جائے جسے بسانے کیلئے منصور نے لوگوں کی املاک سے غصب کر لیا تھا۔ منصور نے جب اس وصیت کا حال سنا تو چیخ اٹھا۔

''ابوحنیفہؒ، زندگی اور موت میں تیری پکڑ سے مجھے کون بچائے۔''

☆☆☆☆☆

خولہ بنت ازورؓ کا کارنامہ

مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کیا تو ایک دن حضرت خالد بن ولیدؓ کو اطلاع ملی کہ محصورین کی مدد کیلئے رومیوں کا ایک دستہ آ رہا ہے۔ انہوں نے حضرت ضرار بن ازورؓ کو پانچ سو سوار دے کر کہا۔

''جس طرح ہو سکے اس دستہ کو راستے ہی میں روک لو۔''

حضرت ضرار بن ازورؓ کی جب رومیوں سے مڈھ بھیڑ ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ کوئی مختصر دستہ نہیں، یہ تو دس بارہ ہزار کا پورا لشکر ہے۔ بہر حال یہ حسب عادت اپنا کرتہ اتار کر اور ہاتھ میں نیزہ لے کر اپنے ساتھیوں سمیت رومیوں پر ٹوٹ پڑے، کشتوں کے پشتے لگائے۔ یہاں تک کہ رومیوں کے سردار کے جنگجو بیٹے عمران کو بھی واصل جہنم کیا۔ لیکن تابہ کے؟ زخمی ہو کے گرفتار ہوئے۔

جب خالد بن ولیدؓ کو ان کی گرفتاری کی خبر ملی تو ہزار مجاہدوں کو دمشق کے باہر چھوڑا، باقی لشکر کو لے کر رومیوں کے مقابلے کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ یکا یک خالد بن ولیدؓ نے دیکھا لشکر اسلام

کے آگے آگے ایک نقاب پوش سرخ رنگ کے گھوڑے پر سوار بڑی تیزی سے میدان جنگ کی طرف بڑھ رہا ہے، حیران ہوئے۔ یہ مجاہد کون ہے، بہر حال اس وقت تحقیق کا موقع نہ تھا۔ جب رومیوں کے لشکر سے مسلمانوں کا سامنا ہوا تو حضرت خالد نے دیکھا کہ وہ نقاب پوش عقاب کی طرح دشمن پر جھپٹ پڑا اور ان کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔ اس کی تلوار یوں چمک رہی تھی جیسے بجلی چمک رہی ہو۔ مجاہد کا جوش دیدنی تھا، ایک بار جب نقاب پوش رومیوں کو کاٹتا ہوا لہولہان ان کے درمیان سے نکلا تو خالد سے نہ رہا گیا، گھوڑا دوڑا کر اس کے پاس گئے اور پوچھا:

خالد بن ولیدؓ: اے مرد مجاہد، تو نے جہاد کا حق ادا کر دیا۔ اللہ اور اس کا رسول تجھ سے راضی ہوں، تو کون ہے؟

نقاب پوش: (کافی تکلف کے بعد) میں ضرار بن ازورؓ کی بہن خولہ بنت ازورؓ ہوں۔ میں اپنے بھائی کی گرفتاری سے سخت بے چین ہوں۔ خدا کی قسم اپنے بھائی کو دشمن کے پنجہ سے رہا کراؤں گی یا اسی کوشش میں جان دے دوں گی۔

خالد بن ولیدؓ: اے ازور کی بیٹی، تو اطمینان رکھ، اگر ضرارؓ زندہ ہے تو انشاء اللہ میں اسے چھڑا کے رہوں گا۔ اور اگر وہ شہید ہو گیا تو میں نے اس کے نقش قدم پر چلنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے خاص دستے کے ساتھ رومیوں پر ایک بھر پور حملہ کیا۔ خولہ بنت ازورؓ بھی ساتھ تھیں اور پُر درد اشعار پڑھ رہی تھیں۔

''اے ضرارؓ تو کہاں ہے کہ آج تو مجھے نظر نہیں آتا اور نہ تو میرے قبیلہ اور قوم کو نظر آتا ہے۔

اے میرے اکلوتے بھائی، اے میرے ماں جائے، تو نے میرا چین برباد کر دیا ہے اور میری نیند حرام کر دی ہے۔''

ان اشعار نے مسلمان مجاہدوں کے دلوں میں آگ بھر دی، وہ بجلیوں کی طرح کوندنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔

جب رومیوں کا ایک دستہ گرفتار ہو کر حضرت خالد بن ولیدؓ کے سامنے پیش ہوا تو انہوں

نے پوچھا:

''ہمارا ایک مجاہد جو گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر، کرتا اتار کر نیزے سے لڑتا ہے، تمہارے ہاتھوں قید ہوا ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟''

رومی: ہاں، ایک ایسا شخص ہم نے گرفتار کیا ہے، ہمارے سردار نے اس کو سو سواروں کی نگرانی میں حمص روانہ کر دیا ہے تا کہ اسے شاہ روم، ہرقل کے سامنے ثبوت کے طور پیش کیا جائے کہ ہمارا واسطہ کس قسم کے جنونیوں سے پڑا ہے، جو اپنی جان کو جان نہیں سمجھتے اور مرنے کو کھیل سمجھتے ہیں۔

یہ ماجرا سن کر حضرت خالدؓ نے سو مجاہدین کو حمص کے راستہ پر روانہ کیا کہ رومیوں کے پنجے سے ان کو چھڑا لائیں۔ اس دستہ کے سردار رافع طائیؓ تھے۔ خولہ بنت ازورؓ بھی اس دستے کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔ یہ دستہ آندھی کی طرح آگے بڑھا اور کافی تگ و دو کے بعد رومیوں کو جا لیا۔ ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کا یوں پیچھا کیا جائے گا۔ رومیوں نے ضرارؓ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک اونٹ کے کجاوے میں ڈال رکھا تھا اور خود ہنستے کھیلتے جا رہے تھے۔ اور ضرارؓ دردناک آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

''اے قاصد، میری قوم کو اور خولہؓ کو یہ خبر پہنچا دے کہ میں اسیر ہوں۔

اور بے بس ہوں اور رسیوں سے جکڑا ہوا ہوں۔

میرے اردگرد شام کے زرہ پوش اور ہتھیار بند کافر ہیں۔

پس، اے دل، تجھ پر آفرین کہ تو ایسے رنج و غم اور اتنی حسرت برداشت کر رہا ہے۔

اے آنسو، ہمت کر، کھل کر میرے رخساروں پر ڈھلک جا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے عزیزوں اور خولہ کو ایک بار دیکھ لوں اور اپنا حال ان کو سناؤں۔''

خولہؓ یہ اشعار سن کر تڑپ گئیں اور پکار کر کہا۔

''اے میرے بھائی اے میرے ماں جائے۔ میں آ پہنچی، میں آ پہنچی''۔

یہ کہہ کر خولہؓ تیر کی طرح رومیوں پر جھپٹیں، دوسرے مجاہدین بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر رومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور چند لمحوں میں رومیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور ضرارؓ کو آزاد کرا لیا۔

اسی جنگ میں ایک بار پھر خولہ بنت ازورؓ نے اپنے عزم اور استقامت اور شجاعت کا سکہ جمایا۔ دمشق ابھی فتح نہیں ہوا تھا کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کو اطلاع ملی کہ ہرقل نے ایک لشکر جرار اجنادین روانہ کیا ہے، حضرت عبیدہؓ سے مشورے کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے دمشق کا محاصرہ عارضی طور پر اٹھا لیا۔ اور ہراول دستے کے ساتھ اجنادین روانہ ہو گئے۔ حضرت عبیدہؓ عورتوں اور بچوں کو اپنی نگرانی میں لے کر لشکر کے پیچھے روانہ ہوئے۔ اس طرح محاصرہ اٹھنے پر دمشق کے دو بڑے پادری پیٹر اور پال سولہ ہزار پیادہ اور سواروں کو لے کر دمشق سے چپکے سے نکلے۔ اور مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ حملہ چونکہ ناگہانی تھا، جب تک مجاہد ادھر پلٹے، رومی کچھ عورتوں کو پکڑ کے پیچھے لوٹ گئے۔ اور ان گرفتاروں میں خولہ بنت ازورؓ بھی تھیں۔ رومیوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور خیمے گاڑ کر ان میں عورتوں کو بند کیا اور آس پاس نگران کھڑے کر دیئے۔ خولہؓ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور قیدی عورتوں سے کہا، بہنو، تمہیں معلوم ہے کہ ہم کون ہیں؟ ہم عرب کے بہادروں کی بیٹیاں ہیں جن کی دلیری اور شجاعت کے قصے نزدیک و دور مشہور ہیں۔ اور ہم مسلمان عورتیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم کی امتی۔ ہم باایمان، باعزت اور باغیرت عورتیں ہیں۔ ان مشرکوں کی قید میں بے عزتی سے زندہ رہنے کے مقابلے میں عزت سے مر جانا ہزار درجے بہتر ہے۔

قیدی عورتیں: ہم تبع اور حمیر قبیلے کی بہادر بیٹیاں ہیں، ہمیں نیزہ بازی بھی خوب آتی ہے اور شہسواری بھی، لیکن ہم کیا کریں، ہمارے پاس نہ نیزے ہیں نہ گھوڑے، رومیوں سے ہم لڑیں تو کیسے لڑیں۔

خولہؓ: بہنو، ہماری ہمت تو یہی ہے کہ ہم بغیر نیزوں اور گھوڑوں کے مزاحمت کریں، دیکھو، کچھ اور نہیں تو خیموں کی یہ چوبیں اکھاڑ لیں اور رومیوں پر پل پڑیں۔ اگر رہائی نہ ملی تو زیادہ سے زیادہ شہید ہو جائیں گی۔ لیکن قید کی ذلت سے تو بچ جائیں گی۔ اور آگے ہمارا کیا انجام ہوتا ہے، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے، تو آؤ ان چوبوں کو تلوار بنا لیں، ان لکڑیوں کو نیزہ سمجھیں اور مشرکوں کو بتا دیں کہ ہم کیا ہیں۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ خولہؓ کی تقریر سن کر تمام عورتیں بجلی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئیں، خیموں کی چوبیں اکھاڑ لیں، خولہؓ نے انہیں ایک نیم دائرے کی شکل میں منظم کیا اور یہ رجز پڑھتی ہوئی رومیوں پر حملہ آور ہوئیں۔

''ہم تبع اور حمیر کی بیٹیاں ہیں، ہمارے نزدیک تمہیں ہلاک کرنا کارِثواب ہے۔

اس لئے ہم لڑائی میں جان سوز آگ بن جاتی ہیں۔

یادرکھو، آج ایک بڑا عذاب تم پر نازل ہونے والا ہے۔''

رومیوں نے چاروں طرف سے ان مجاہدات کا محاصرہ کر لیا۔ جو آگے بڑھتا وہ خیموں کی چوبوں سے اس پر حملہ کر دیتیں۔ اس کشمکش میں کئی رومی مارے گئے۔ آخر کار انہوں نے ان عورتوں پر باقاعدہ حملے کا منصوبہ بنالیا ادھر جب حضرت خالد بن ولیدؓ اور ضرار بن ازورؓ کو عورتوں کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ ایک تیز رفتار دستے کے ساتھ جھپٹے، عین اس وقت جب رومی ان عورتوں پر حملہ کرنے کیلئے پر تول رہے تھے وہ سر پر آن پہنچے، رومیوں نے جب ان کی دھاڑ سنی تو حواس باختہ ہو کر بھاگے، ضرارؓ نے برق رفتاری سے بڑھ کر پیٹر کو جالیا اور اپنا نیزہ اس کے دل میں اتار دیا۔ اس طرح ضرارؓ نے اپنی بہن سمیت تمام عورتوں کو آزاد کرالیا۔ لیکن اصل میں یہ کامیابی خولہؓ ہی کی مرہون منت تھی۔

☆☆☆☆☆

شہادت کے طالب کو زرہ کی کیا ضرورت؟

ہمارے جن بزرگوں نے غیر حق کے سامنے تادم مرگ سر تسلیم خم نہیں کیا ان میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بہت ممتاز ہیں، حضرت ابن زبیرؓ کا واسطہ بھی یزید جیسے ظالم اور فاسق شخص سے پڑا تھا جس نے اسلامی نظام کا شیرازہ بکھیرنے کی ابتداء کی تھی۔ یزید حضرت ابن زبیرؓ کو زیر نہ کر سکا اور مر گیا۔ لیکن جب یزید کے خاندان کا عبدالملک بن مروان تخت نشین ہوا تو اس نے چالیس ہزار فوج سے حضرت ابن زبیرؓ پر چڑھائی کی۔ حجاج بن یوسف، مشہور جابر اور سفاک فوج کا سپہ سالار تھا، حضرت ابن زبیرؓ کے ساتھی اس کے مظالم کی تاب نہ لا سکے اور گھبرا گئے۔ حضرت ابن زبیرؓ اپنی والدہ حضرت اسماءؓ کی خدمت میں آئے حضرت اسماءؓ اس وقت سو سے اوپر تھیں۔ یہ سیدنا ابوبکر

صدیقؓ کی وہ بیٹی ہیں، جنہوں نے انتہائی خطرہ مول لے کر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو غار ثور میں کئی روز کھانا پہنچایا۔ حضرت ابن زبیرؓ نے عرض کیا۔

''اماں، میرے ساتھیوں میں بھوک پیاس کی وجہ سے مقاومت کی طاقت نہیں رہی ہے، دشمن کہتا ہے کہ اب بھی اطاعت قبول کرلو تو اچھا سلوک کروں گا، آپ کے مشورے اور رہ نمائی کی ضرورت ہے''۔

حضرت اسماء: بیٹا، حق کی خاطر لڑ رہے ہو تو کسی بات کی پرواہ نہ کرو، لڑو اور مر جاؤ، اطاعت کا کیا کام ہے اور مجبوریوں کے کیا معنی؟ اور اگر لڑائی حکومت حاصل کرنے کے شوق میں شروع کی تو تم برے آدمی ہو، تم نے اپنے آپ کو تباہ کیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو بھی تباہ کر دیا۔ اہل حق اس بات کی فکر نہیں کیا کرتے کہ ان کے مددگار کیا کہتے ہیں اور کتنے ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

ابن زبیر: اماں جان، مجھے اپنی جان کی پرواہ ہرگز نہیں ہے۔ خیال صرف یہ ہے کہ میری لاش کا برا حال کیا جائے گا۔ ٹکڑے ٹکڑے کریں گے اور کتوں کو کھلائیں گے۔ آپ ان زیادتیوں کو کیسے دیکھ سکیں گی۔

حضرت اسماء: بیٹا جب روح ہی تمہارے جسم میں نہ رہے گی تو پھر جسم کا وہ جو چاہیں بنائیں، مجھے اس سے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا تمہارے غیر حق کے آگے سر جھکانے سے ہوگا۔

یہ سن کر حضرت ابن زبیر کھڑے ہو گئے اور میدان جنگ کی طرف چلے، حضرت اسماء نے انہیں گلے لگایا اور پیار سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، پیٹھ پر سخت سی چیز محسوس ہوئی۔

حضرت اسماء: یہ کیا ہے؟

ابن زبیر: زرہ ہے۔

حضرت اسماء: تو ابوبکرؓ کا نواسہ اور زبیر کا بیٹا ہو کر زندگی پر فریفتہ ہے؟ شہادت کے طالب کو زرہ کی کیا ضرورت ہے؟ زرہ پھینک اور بہادروں کی طرح مر، فرشتے تیری

روح حضور خداوندی میں پیش کرنے کے منتظر ہیں۔

حضرت ابن زبیر نے زرہ اتار دی۔ اور کشتوں کے پشتے لگا کر جام شہادت پیا۔ حجاج نے سر کاٹ کر عبدالملک کو بھیج دیا۔ اور لاش لٹکا دی اور خود حضرت اسماء کے پاس پہنچا اور بولا،

''تم نے بیٹے کا حشر دیکھ لیا؟''

حضرت اسماءؓ نے فرمایا،

''ہاں۔ دیکھ لیا، تو نے اس کی دنیا خراب کر دی۔ اور اس نے تیری عقبیٰ بگاڑ دی۔''

☆☆☆☆☆

حکام کے پاس جانا میرے مسلک کے خلاف ہے

جن لوگوں نے ملک امیر محمد خان نواب آف کالا باغ کا نام سنا ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ کیسے باجبروت حاکم اور جاگیردار تھے اور کس طرح آن کی آن میں بڑے بڑے عزت داروں کو بے عزت کر دیا کرتے تھے۔ لیکن ایک درویش خود آگاہ و خدا مست کے سامنے انہیں بھی جھکنا پڑا۔

یہ بزرگ لاہور کے مشہور محدث اور عالم مولانا محمد ادریس کاندھلوی تھے۔ جنہوں نے مشکوٰۃ کی شرح عربی میں لکھی ہے۔ مولانا کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ عالم باعمل تھے، جو کہتے تھے وہ کرتے تھے، تصویر کھنچوانے کو ناجائز سمجھتے تھے تو زندگی بھر تصویر نہیں کھنچوائی۔ عشق رسول ﷺ کا یہ عالم تھا کہ کرسی پر بیٹھنا خلاف سنت سمجھتے تھے، چنانچہ تاحیات نہ کرسی پر بیٹھے اور نہ کرسی گھر میں رکھی۔

جس زمانے میں ملک صاحب مغربی پاکستان کے مطلق العنان گورنر تھے، خدا نے ان کے دل میں نیکی ڈالی اور مولانا کاندھلوی سے نیاز حاصل کرنے کے خواہشمند ہوئے۔ اور ایک جان پہچان کے مولوی صاحب کو مولانا کاندھلوی کی خدمت میں بھیجا۔

مولوی صاحب: نواب صاحب نے سلام بھیجا اور آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔

مولانا: سلام کا جواب تو وعلیکم السلام ہے، لیکن ملاقات کیلئے میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔

مولوی صاحب: خیر باشد، کیوں؟

مولانا: اس لئے کہ حکام کے پاس جانا میرے مسلک کے خلاف ہے، ہاں اگر وہ یہاں آنا چاہیں تو شوق سے آئیں۔ مگر اس کی بھی شرط ہے۔

مولوی صاحب: وہ کیا؟

مولانا: وہ یہ کہ میں اپنے کمرے میں کرسی نہیں رکھنے دوں گا، بیٹھیں گے تو میرے ساتھ دری پر بیٹھیں گے۔ گورنر پنجاب نواب کالاباغ نے یہ شرط بھی مانی۔ اور مولانا سے ان کے حجرے میں اسی دری پر بیٹھ ملاقات کی جو وہاں برسوں سے بچھی تھی۔

☆☆☆☆☆

خداوندی کا چسکا

4 اگست 1980ء کے روزنامہ جنگ میں احمد ندیم قاسمی نے اپنے کالم ''لاہور، لاہور ہے'' میں کراچی کے ایک صاحب، رضوان عنایتی کا ایک مراسلہ نقل کیا ہے۔ مراسلہ پاکستان کے معاشی مسائل کے بارے میں ہے لیکن ضمناً اس میں مراسلہ نگار نے ایک سرکاری منصب کے بارے میں اپنے والد اور ان کے دادا کے مابین ایک گفتگو نقل کی ہے۔ اور اس سے پہلے انہوں نے اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں لکھا ہے۔

''میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس میں تقریباً پانچ صدیوں سے جاگیرداری، زمینداری کے ساتھ ساتھ سپہ گری، علم و ادب، فقر و درویشی کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے، لیکن ہمارے بزرگوں نے علم کو علم اور فقر کو فقر کے مقام پر ہی رکھا، اور اس اعزاز کو شہرت کے حصول یا زرگری کا ذریعہ نہیں بنایا۔ جو کچھ موروثی جائداد سے ملتا، اس سے اپنی ضروریات بھی پوری کرتے اور ارباب علم و حق کی خدمت بھی سعادت سمجھ کے کرتے۔ وہ لوگ کبھی کسی سرکار یا دربار سے وابستہ نہیں ہے۔ ریاست رامپور کے نواب ان سے ملنے کے مشتاق رہتے لیکن ان کی بے نیازی میں فرق

نہیں آیا۔ چنانچہ خاندان کا کوئی فرد ریاست میں ملازمت میں نہیں رہا۔ ایک روز میرے والد اوران کے والد کے والد یعنی پوتے اور دادا میں یہ گفتگو ہوئی۔

پوتا: دادا جان، آپ سے ایک بات کہنا ہے۔

دادا: کہو بیٹا، کیا بات ہے؟

پوتا: آپ کے پاس ریاست کے بعض حکام آتے رہتے ہیں۔

دادا: وہ تو آتے ہیں، پھر؟

پوتا: اگر آپ ان میں سے کسی سے اشارہ کردیں تو میرا تقرر تحصیلدار کے منصب پر آسانی سے ہو جائے گا۔

دادا: یہ لوگ تو خود ضرورتمند ہیں اور ہمارے پاس آتے ہیں، ہم ان سے کس طرح طلب گار ہو سکتے ہیں۔

پوتا: جی

داد: بیٹا، کیا تم کسی کے قرضدار ہو گئے ہو؟

پوتا: جی نہیں

دادا: تو پھر تم نے اپنی ضروریات بہت زیادہ بڑھالی ہوں گی۔

پوتا: نہیں، دادا ابا ایسا بھی نہیں ہے۔

دادا: تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمہیں داد و دہش کا شوق ہو چلا ہے۔ ویسے اگر آج میں ہادی حسن خان سے کہہ دوں تو کل تمہارا تقرر ہو جائے گا۔ لیکن جانتے ہو پھر کیا ہوگا؟

پوتا: نہیں، آپ فرمائیں۔

دادا: تم ایسے نقار خانے میں پہنچ جاؤ گے جس کے شور میں تمام حقائق گونگے ہو جاتے

ہیں۔ اور پھر ایک دن جب اقتدار کا ہما تمہیں کج ادائیوں میں مبتلا کر کے کسی اور کے سر پر جا بیٹھے گا تو پھر تمہارے چاروں طرف ایسا بھیانک سناٹا ہو گا کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

دیکھو میرے بچے، ابھی تک ایک خدا کو جانتے ہو، تحصیلدار ہو جانے کے بعد تمہارے کئی خدا ہو جائیں گے۔ اور تم بھی بہت سوں کے خدا ہو جاؤ گے۔ انسان کو جب خداوندی کا چسکا لگ جائے تو پھر وہ بحیثیت انسان کے کبھی نہیں ابھر سکتا۔

باب دوم

حکایات

جان، بیٹا، خلافت پہ دے دو

تحریک خلافت کے دوران علی برادران مولانا شوکت علی اور محمد علی، انگریز حاکموں کے حکم سے نظر بند تھے کہ ایک خلافتی کارکن انکی بوڑھی والدہ (جو اماں بی کے نام سے مشہور تھیں) کے پاس آئے۔

کارکن: آپ نے محمد علی، شوکت علی کے بارے میں کچھ سنا؟

بی اماں: نہیں بیٹا۔

کارکن: افواہ اڑی ہے کہ دونوں جلدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

بی اماں: کیوں، کیا خاص بات ہوئی؟

کارکن: وہ جو عبدالحمید کاکڑ ہیں نا،

بی اماں: جانتی ہوں، سخت سرکار پرست ہیں۔

کارکن: وہ محمد علی، شوکت علی پر ڈورے ڈال رہے ہیں۔

بی اماں: کیا مطلب؟

کارکن: انہوں نے انہیں پیغام بھیجا ہے کہ میں نے حکومت کو آپ کو رہا کرنے پر رضامند کر لیا ہے بشرطیکہ آپ بھی حکومت کی چند شرطیں مان لیں اور رہائی کی درخواست پر دستخط کر دیں۔

بی اماں: آپ فوراً دونوں کو میرا یہ پیغام دیں کہ میں نے تمہیں صرف خدا کے سامنے جھکنے کی تربیت دی ہے۔ اگر تم نے رہائی کیلئے حکومت برطانیہ کے سامنے جھکنا قبول کر لیا اور رہائی کی درخواست پر دستخط کیئے تو میں دونوں کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دوں گی۔ اور حشر کے دن اپنا دودھ بھی نہیں بخشوں گی۔

علی برادران کو یہ پیغام پہنچا تو انہوں نے یہ جواب بھجوایا۔

''اماں بی، آپ کے فرمانبردار بیٹے، اپنے سر تو کٹا سکتے ہیں لیکن طاغوت کے سامنے سر جھکا نہیں سکتے۔''

اس کا جواب ظفر علی خان نے یوں نظم کیا۔

مجھ سے بجز خدا کے، کسی کے حضور میں
اپنا سرِ نیاز جھکایا نہ جائے گا

بی اماں کا یہ پیغام:

بولیں اماں محمد علی کی
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی
جان، بیٹا، خلافت پہ دے دو
جان، بیٹا، خلافت پہ دے دو

ملک کے طول وعرض میں گونجنے لگا اور تحریک خلافت کا نعرہ بن گیا۔ ان اماں بی کا نام آبادی بیگم تھا۔ 1857ء میں جب ان کی عمر سات برس کی تھی تو انہوں نے چچا کو بغاوت کے الزام میں انگریزوں کے ہاتھوں پھانسی چڑھتے دیکھا تھا۔ گویا انگریزی سامراج سے بغاوت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ 1921ء میں جب انہوں نے تحریک خلافت میں حصہ لینا شروع کیا تو ان کی عمر چند سال اوپر ستر برس کی تھی۔ لیکن ان کی جواں ہمتی نے تحریک خلافت کے لہو کو گرما دیا تھا۔

''جان، بیٹا، خلافت پہ دے دو'' کے عنوان سے یہ واقعہ تحریک آزادی کے محقق رضوان احمد نے روزنامہ جنگ کراچی میں لکھا۔

☆☆☆☆☆

راستے ان کے کاٹے جاتے ہیں جن کے پہنچنے کا امکان ہوتا ہے

منیٰ، مکہ معظّمہ کے مضافات میں مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ایک بستی ہے۔ یہ وہ جگہ

ہے جہاں ابلیس نے حضرت ابراہیم کو تین بار تین مقامات پر بہکانے کی کوشش کی تھی۔ اب ان تین مقامات پر تین جمرے (پتھر) گڑے ہیں۔ ان جمروں پر حجاج حج کے دنوں میں پتھر مارتے ہیں۔ یہ عمل بھی حج کے مناسک میں سے ایک ہے۔ منٰی صرف حج کے دنوں میں آباد ہوتا ہے۔ سال کے باقی دنوں میں ویران رہتا ہے۔

جب ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب کے ساتھ 1968ء میں حج کو گئے تو منٰی کے قیام کے دوران راستہ بھول کر بھٹکتے پھرے۔ بالآخر ایک روشن ضمیر بزرگ کی وساطت سے اپنی منزل پر پہنچے تو شہاب صاحب سے ان کی یہ گفتگو ہوئی:

قدرت اللہ شہاب: ہم بڑے فکر مند تھے، ہمارا خیال تھا آپ راستہ بھول گئے ہیں۔

ممتاز مفتی: ہاں، میں راستہ بھول گیا تھا۔

قدرت اللہ شہاب: چلو اچھا ہوا، آپ لوٹ آئے۔

ممتاز مفتی: یہ منٰی ہے۔

قدرت اللہ شہاب: کیا مطلب؟

ممتاز مفتی: یہاں بہت سے لوگ راستہ بھول جاتے ہیں، بہت سے لوگوں کا راستہ کاٹا جاتا ہے، بہت سے لوگوں کے قیام کو متزلزل کر دیا جاتا ہے، متحمل لوگوں کو منتشر کر دیا جاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب: ہوں۔

ممتاز مفتی: یہ شہر نہیں ایک جائے امتحان ہے۔ اور مجھ ضعیف و ناتواں میں اتنی ہمت نہیں کہ امتحان میں پڑوں، میں یہاں رکنا نہیں چاہتا۔

قدرت اللہ شہاب: نہیں، نہیں، ایسا نہ کیجیے، جن کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں، جن کی راہ کاٹی جاتی ہے وہ بڑے خوش قسمت لوگ ہیں۔

ممتاز مفتی: خوش قسمت؟

قدرت اللہ شہاب: راستے صرف ان کے کاٹے جاتے ہیں جن کے پہنچنے کا امکان ہوتا ہے، اگر آپ کا راستہ کاٹا جاتا ہے تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آپ میں پہنچنے کی صلاحیت ہے، اس سے زیادہ خوشی کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔ امتحان میں پاس یا فیل ہونا اہم نہیں، اہم یہ ہے کہ آپ کے چلنے میں وہ نیک نیتی وہ خلوص، وہ جذبہ ہے جو پہنچانے کا ضامن بن جاتا ہے۔ آپ کو علم ہے مفتی صاحب حضور اعلیٰ کو منیٰ کے راستے مکہ معظّمہ میں داخل ہونا کتنا پسند تھا۔

☆☆☆☆☆

سارا کھیل توجہ کا ہے

''لبیک'' میں ممتاز مفتی نے حرم شریف کے اندر نماز کے وقت کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ حرم پاک میں اس روز حسب معمول ہزاروں نہیں، لاکھوں زائرین موجود تھے۔ جب زائرین نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو صفیں مکمل کرنے کیلئے لوگوں نے آگے کی طرف یورش کی۔ اس کشمکش میں ایک بڑے میاں کو ایسا دھکا لگا کہ وہ لڑھک کر دور جا پڑے۔

''واہ صاحب، واہ عجیب تماشہ ہے'' بڑے میاں بڑبڑانے لگے۔ ممتاز مفتی بڑے انہماک سے بڑے میاں کی باتیں سن رہے تھے۔ اور لوگوں کی کشمکش کا نظارہ دیکھ رہے تھے کہ قدرت اللہ شہاب نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پھر یہ باتیں ہوئیں:

قدرت اللہ شہاب: شیطان کے جال میں نہ پھنسو۔

ممتاز مفتی: میں تو بڑے میاں کی باتیں سن رہا تھا۔

قدرت اللہ شہاب: بڑے میاں بھی تو اسی جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ممتاز مفتی: اسی جال میں پھنسے ہوئے ہیں؟

قدرت اللہ شہاب: ہاں، یہی شیطان کا جال ہے۔

ممتاز مفتی: میں سمجھا نہیں۔

قدرت اللہ شہاب: لوگ اتنے شوق سے یہاں آتے ہیں اور پھر معمولی تفصیلات میں الجھ کر اپنی منزل کھوٹی کر لیتے ہیں۔ سارا کھیل توجہ کا ہے، توجہ کو بھٹکنے نہ دو۔ ورنہ یہ لمحات ضائع ہو جائیں گے۔

ممتاز مفتی: جی۔

قدرت اللہ شہاب: یہاں کوئی تفصیل اہم نہیں، کچھ بھی اہم نہیں، صرف ایک حاضری، حضوری کا احساس، لیکن ہم حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

یہ خون تو پاکستان کیلئے بہنا تھا

پاکستان بننے سے پہلے کا قصہ ہے بمبئی میں مسلمانوں کے محلے کا ایک مسلمان بچہ بھاگا بھاگا کہیں جا رہا تھا کہ سڑک پر ٹھوکر کھا کر گرا، چوٹ آئی، خون بہنے لگا، خون دیکھ کر وہ رونے لگا، بچے کو روتا دیکھ کر دو ایک راہ گیر مسلمان رک گئے۔

پہلا راہگیر: ابے مسلمان کا بچہ ہو کر تھوڑا سا خون بہہ جانے پر رو رہا ہے۔

دوسرا راہگیر: شرم کر، شرم، یہ بات سی بات ہے۔

بچہ: جناب، چوٹ لگنے اور خون نکلنے پر نہیں رو رہا، میں تو اس لئے رو رہا ہوں کہ جو خون پاکستان کیلئے بہنا تھا، آج بے کار ہی بہنے لگا۔

مطلوب الحسن سید اپنی کتاب ''ہمارے قائد'' میں لکھتے ہیں، جب میں نے واقعہ قائداعظم کو سنایا تو انہوں نے فرمایا:

''اب پاکستان کے بننے کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔''

☆☆☆☆☆

حاتم سے بھی بڑھ کر

ایک دن حاتم طائی نے ایک دونہیں پورے چالیس اونٹ ذبح کئے اور منادی کرادی کہ آج سارا قبیلہ، اپنے، غیر، اجنبی اور مسافر، سب میرے مہمان ہوں گے۔

دعوت، اور وہ بھی حاتم طائی کی دعوت، اچھے سے اچھا کھانا، اور اس سے بھی بڑھ کر خاطر تواضع، کون انکار کرتا۔ ایک خلقت ٹوٹ پڑی، حاتم نے سب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کھانا شروع ہوا۔ کچھ دیر کے بعد حاتم کو کسی کام سے جنگل جانا پڑا۔ وہاں دیکھا کہ ایک بوڑھا لکڑہارا پسینے پسینے ہوا ہے اور لکڑیاں کاٹ رہا ہے۔ اسے بڑا تعجب ہوا جب کہ ساری خدائی دعوت کا لطف اٹھا رہی ہے یہ اللہ کا بندہ لکڑیاں کاٹنے کی مشقت کر رہا ہے۔

وہ اس کے پاس گیا اور پوچھا:

حاتم: بھلے مانس، یہ تو کیا کر رہا ہے؟

لکڑہارا: بھائی، لکڑیاں کاٹ کر بستی میں لے جاؤں گا۔ اور انہیں بیچ کر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالوں گا۔

حاتم: کیا تم نے سنا نہیں کہ بستی میں ایک بہت بڑی دعوت ہو رہی ہے۔ اور صلائے عام ہے۔ جس کا جی چاہے آئے، کھائے، پیئے اور چلا جائے۔

لکڑہارا: ہاں بھائی، میں نے سنا ہے کوئی بڑا سخی جوان مرد ہے، اس نے چالیس اونٹ ذبح کئے ہیں اور بڑے شوق سے سب لوگوں کی دعوت کی ہے، اللہ اس کا بھلا کرے۔

حاتم: پھر تم دعوت میں کیوں نہ گئے؟ اس عمر میں اتنی مشقت کر رہے ہو، ایک وقت تو کھانے کا مزہ اٹھا لیتے۔

لکڑہارا: بھائی تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن جو آدمی محنت کی روٹی کماتا ہے وہ کسی کا احسان نہیں اٹھاتا۔

☆☆☆☆☆

ایک پوستین کی کہانی

کہنے کو تو ایاز ایک غلام تھا۔ لیکن محمود غزنوی کی آنکھ کا تارا تھا۔ دوسرے امراء کو یہ بات بہت کھٹکتی تھی۔ وہ ٹوہ میں لگ گئے کہ اس میں کوئی خامی نظر آئے تو بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکائیں۔ آخر کو ان کی مراد بھر آئی۔ دیکھا کہ ایاز جمعہ کے جمعہ صبح سویرے خزانے کا تالہ کھول کر اندر جاتا ہے اور کچھ دیر اندر رہتا ہے۔ بظاہر بڑی مشکوک بات تھی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انسانی طبیعت بھی عجیب ہے، دشمن کی خوبی سے الجھن ہوتی ہے، اس پر غصہ آتا ہے۔ لیکن اس کی امکانی خامی سے دل خوش ہوتا ہے۔ یہی حال ایاز کے حریفوں کا تھا۔ انہیں ایک شوشہ ہاتھ آ گیا تھا، اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتے۔ بادشاہ سے خوب خوب لگائی بجھائی کی۔ انسان، آخر انسان ہے۔ اپنے غلام کی وفاداری پر بادشاہ کو پورا بھروسہ تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ اس کو کوئی سزا دینے سے پہلے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے کہ خزانے میں وہ کرتا کیا ہے۔ اور ہیرے جواہرات چراتا ہے تو کیسے چراتا ہے؟ چنانچہ ایک جمعہ کی صبح سویرے ایاز کے خزانے میں پہنچنے سے پہلے وہ خود وہاں جا کر چھپ کر بیٹھ گیا۔

مقررہ وقت پر ایاز آیا اور خزانے کے ایک گوشے میں سے ایک پرانا صندوق نکالا، اس کو ایک کنجی سے کھولا اور اس احتیاط سے کوئی چیز نکالی جیسے کوئی بڑی قیمتی شے ہو۔ بادشاہ سمجھا، ضرور اس میں جواہرات بھرے ہوں گے۔ لیکن اسنے جو غور سے دیکھا تو یہ بھیڑ کی کھال کی بغیر آستین کے پوستین تھی، نہایت خستہ حالت۔ غلام نے اپنے امیرانہ کپڑے اتارے، اس پوستین کو پہنا اور کچھ دیر کے بعد اتار کر اسی طرح اس پرانے صندوق میں اس کو بند کر دیا۔ اور احتیاط سے تالا لگا دیا۔ پھر مہر لگائی اور دروازے کی طرف چلا، محمود حیران و پریشان اس منظر کو دیکھ رہا تھا، اس سے ضبط نہ ہوا، وہ عصائے شاہی کو لے کر سامنے آ گیا۔

محمود: کیوں، ایاز، یہ کیا ہو رہا ہے؟

ایاز: حضور یہاں کہاں؟

محمود: ہم تمہاری چوری پکڑنے آئے تھے، لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔

ایاز: حضور والا، میں شرمندہ ہوں۔

محمود: ایاز، اس پوستین کا راز کیا ہے؟

ایاز: حضور نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔

محمود: مابدولت اس راز کو جاننا چاہتے ہیں، ہمیں تو کچھ اور بتایا گیا تھا۔

ایاز: حضور، راز، راز رہے تو اچھا ہے۔

محمود: نہیں، ہم حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔

ایاز: حضور، یہ وہ پوستین ہے جو میں آپ کے قدموں میں آنے سے پہلے پہاڑوں میں پہنے گھوما پھرا کرتا تھا۔ اور مجھے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں میسر تھا۔ آج حضور کی نظر کرم کی بدولت میں خود امیر کبیر ہوں، اطلس و کمخواب کی خلعت میرے بدن پر ہے۔ اس میں ہیروں کے تکمے لگے ہوئے ہیں، میری جاگیر ہے، میرے دسترخوان پر دنیا کے لذائذ سجتے ہیں، میں اور میرے متوسلین ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے آقا آپ کے کرم، آپ کے احسان کی بدولت ہے۔ میں جمعہ کے جمعہ اس پوستین کو اسلئے اپنے بدن پر ڈال لیا کرتا ہوں کہ مجھے یاد رہے کہ میں کیا تھا اور اب جو کچھ ہوں وہ کس نے بنایا ہے۔

پوستین اس غلام ایاز ہی کی نہیں تھی، ایک پوستین ہم سب پاکستانیوں کی بھی ہے۔ ہمیں بھی کبھی کبھی یاد کر لینا چاہیے کہ ہم کیا تھے۔ اور اب کیا ہیں اور کس کے فیض سے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شکر نعمت

حضرت لقمان ایک امیر کے ہاں ملازم تھے، وہ شخص حضرت لقمان کا بڑا قدردان تھا۔ ان کے کم سن بیٹے کو اس نے اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔ وہ اسے مٹھائیاں پھل، لذیز میوے کھلاتا رہتا تھا اور ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتا تھا۔ ایک دن ایک مصاحب نے امیر کی خدمت میں خربوزے کی طرح

کا ایک پھل پیش کیا جو خربوزے سے زیادہ خوش رنگ اور خوبصورت تھا، امیر نے فوراً چاقو منگوایا اور اس کی ایک قاش کاٹ کر از راہ مہربانی حضرت لقمان کے بیٹے کو دی جو اس وقت امیر کی مسند کی قریب بیٹھا ہوا تھا۔ بچے نے وہ قاش ذوق وشوق سے کھائی۔ اس کے ذوق وشوق کو دیکھ کر امیر نے مزید دو قاشیں اس کو دیں جو اس نے مزے لے لے کر کھائیں۔ بچے کے ذوق وشوق سے امیر کو گمان گزرا کہ یہ ضرور کوئی لذیذ پھل ہے۔ یہ سوچ کر آخری قاش خود منہ میں لی۔ قاش کا منہ میں رکھنا تھا کہ اس کی کڑواہٹ سے اس کا برا حال ہو گیا۔ جو ٹکڑا منہ میں تھا تھوک دیا اور پھر بڑی دیر تک کلیاں کرتا رہا۔ تب کہیں جا کر چین آیا۔ اگرچہ منہ کی کڑواہٹ اب بھی قدرے باقی تھی۔

امیر: بچے، یہ پھل تو اتنا کڑوا تھا۔ پھر تو اسے اتنے ذوق وشوق سے کیسے کھاتا رہا؟

بچہ: میرے آقا، آپ اتنے عرصے سے ہر روز مجھے لذیذ پھل اور مٹھائیاں کھلاتے رہے ہیں، اگر آج ایک کڑوا پھل کھانا پڑ گیا تو میں کیا اتنے دنوں کا احسان بھول جاتا؟ کڑوا پھل کھا کر اگر میں منہ بناتا تو یہ بڑی احسان فراموشی کی بات ہوتی۔

☆☆☆☆☆

کھٹا انار

تاریخ عامری میں ہے کہ ایک ترک تاجر اور اس کے داروغہ میں ایک روز یہ گفتگو ہوئی۔

آقا: مبارک، ذرا بھاگ کے باغ سے ایک انار توڑ لاؤ۔ ہاں دیکھو، انار کھٹا ہو، آج مجھے کھٹے انار کی ضرورت ہے۔

مبارک: بہت بہتر جناب۔

آقا: (انار کو چکھ کر) مبارک میں نے تو تم سے کھٹا انار لانے کو کہا تھا، یہ تو خاصا میٹھا ہے۔

مبارک: اتفاق کی بات ہے۔

آقا: اتفاق کیا، تم اتنے عرصے سے باغ کی رکھوالی کر رہے ہو اور تمہیں کھٹے میٹھے درخت کی بھی پہچان نہیں؟

مبارک: جناب آپ نے باغ کی رکھوالی کا حکم دیا تھا۔ میں وہی خدمت بجالاتا ہوں۔ انار چکھنے کی اجازت آپ نے نہیں دی تھی، اس لئے مجھے نہیں معلوم کس درخت کا پھل میٹھا ہے کس کا کھٹا۔

آقا: مبارک، میں تمہارے جواب سے خوش ہوں۔ ایسے ایماندار اور سمجھدار آدمی کی جگہ باغ نہیں میری حویلی ہے۔ آج سے تم میرے مشیر ہو، تم باغ کی رکھوالی چھوڑ دو اور میرے یہاں آ کر رہو اور مجھے میرے معاملات میں مشورہ دیا کرو۔

مبارک اپنے ترک آقا کی حویلی میں اٹھ آیا۔ اور اتنی سمجھ بوجھ سے اپنی نئی ذمہ داریوں کو نبھایا کہ اس کا اعتبار بڑھتا ہی گیا۔ ایک روز دونوں میں یہ باتیں ہوئیں۔

آقا: جناب مبارک، آپ سے ایک مشورہ کرنا تھا۔

مبارک: فرمائیے۔

آقا: اس کا تعلق کاروبار سے نہیں، میرے ذاتی معاملات سے ہے۔

مبارک: جو میری سمجھ میں آئے گا، عرض کروں گا۔

آقا: بات یہ ہے کہ میری بیٹی ماشاء اللہ اب بڑی ہوگئی ہے، میں اس کی شادی کی فکر میں ہوں، رشتے تو بہت ہیں، تمہاری رائے میں بیٹی کا ہاتھ کس کے ہاتھ میں دینا چاہیے۔

مبارک: جاہلیت میں عرب، خاندان اور خون دیکھتے تھے یعنی حسب نسب۔ یہودیوں کا معیار ہے مال و دولت، عیسائی حسن و خوبصورتی کو اہمیت دیتے ہیں۔ مگر اسلام میں دین کا اعتبار ہے۔ اب آپ جو معیار چاہیں پسند کر لیں۔

آ قا: اللہ گواہ ہے مبارک، کہ تم نے بہت اچھی بات کی ہے۔

ترک آ قا نے اپنی بیوی کو ساری بات کہہ سنائی، اس پاکباز و پاک طینت خاتون نے جواب دیا، مشورہ تو بالکل صائب ہے، تو شوہر نے بیوی سے کہا۔

''جب معیار دین ٹھہرا تو مبارک کیا برا ہے۔''

بیوی نے کہا بسم اللہ۔

تاریخ میں ہے کہ عبداللہ بن مبارک جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں، انہی مبارک کے بیٹے تھے۔

☆☆☆☆☆

باغ کا رکھوالا

ابو یعقوب الجزائر اور مراکش کے شہزادے تھے۔ ابراہیم بن ادھم کی طرح انہوں نے تخت و تاج چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی۔ بیروت میں ان کا مزار ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ پھرتے پھراتے محنت مزدوری کرتے دمشق پہنچے۔ شہر کے باہر بادشاہ وقت نورالدین زنگی کے باغات تھے۔ وہیں رکھوالے کی نوکری کر لی۔ کوئی چھ مہینے اس خدمت کو گزرے ہوں گے کہ بادشاہ باغ میں آیا۔ باغ کے داوراغہ نے ابو یعقوب سے انار توڑ کر لانے کو کہا انہوں نے جو انار توڑ کر پیش کئے وہ اتفاق سے سب کے سب کھٹے نکلے۔ داروغہ نے باز پرس کی۔

داروغہ: اے ابو یعقوب، میں تو تم پر بڑا اعتماد کرتا تھا، آج تم نے میری نوکری خراب کر دی۔

ابو یعقوب: مجھ سے کیا خطا ہوئی؟

داروغہ: میں نے بڑے مان سے تم سے انار توڑ کر لانے کو کہا تھا، جو انار تم توڑ کر لائے وہ سارے کے سارے کھٹے تھے، بادشاہ کیا کہے گا، چھ مہینے ہو گئے تمہیں کھٹے میٹھے پیڑ اور پھل کی پہچان نہ ہوئی۔

ابو یعقوب: جناب میں نے تو اپنی طرف سے آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کی ہے،

باغ کے پیڑ پیڑ بلکہ شاخ شاخ کی رکھوالی کی ہے۔ کھٹے میٹھے پھل کی پہچان تو تب ہوتی جب میں پھلوں کو چکھتا رہتا۔ جناب آپ نے رکھوالی کرنے کا حکم دیا تھا، کھٹے میٹھے کا پتہ رکھنے کو نہیں کہا تھا۔

ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ جب شدہ شدہ یہ بات نورالدین زنگی تک پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور ابو یعقوب کو بلا کر اس سے باتیں کیں۔ اور تاڑ گیا کہ اس کی اصل کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

پکا قلعہ

بادشاہ وقت کا حکم ہوا کہ ایک مضبوط ترین، ناقابلِ تسخیر قلعہ بنایا جائے۔ خواہ روپیہ کتنا ہی صرف ہو۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور صرف زرکثیر سے وہ قلعہ بن کے تیار ہو گیا۔ جس کی بادشاہ کو خواہش تھی، جس نے دیکھا دنگ رہ گیا۔ خوشامدیوں اور موقع پرستوں کی بن آئی۔

درباری: جہاں پناہ، قلعہ کیا ہے فولاد ہے۔

درباری: یہ انسانوں کی نہیں، دیوؤں کی تعمیر معلوم ہوتا ہے۔

درباری: یہ قلعہ ناقابل تسخیر ہے، دشمن کی دست درازی سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

درباری: دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

بادشاہ: بہت خوب، بہت خوب، آپ بھی تو (بوڑھے وزیر سے خطاب کرتے ہوئے) کچھ فرمائیے۔

وزیر: خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

بادشاہ: کیوں؟

وزیر: اس لئے کہ جھوٹ کہنا نہیں چاہتا، سچ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔

بادشاہ: آپ ہمارے بزرگ مشیر ہیں، آپ نے ہمارے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ اوران کے ساتھ بڑی بڑی مہمات میں حصہ لیا ہے۔ مابدولت آپ کی فہم و فراست کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ جو کچھ آپ محسوس کرتے ہیں بلا جھجک کہئے۔

وزیر: جہاں پناہ! آپ نے اور آپ کے والد نے بڑے قلعے جیتے اور بڑی فتوحات کیں۔

بادشاہ: ہاں، کیوں نہیں۔

وزیر: کیا وہ قلعے مضبوط نہ تھے؟

بادشاہ: مضبوط کیوں نہیں تھے، یہ تو ہمارا کمال تھا کہ ہم نے ان مضبوط قلعوں کو سر کیا۔

وزیر: معلوم ہوا کہ قلعہ چاہے کتنا ہی مضبوط ہو، سر کیا جا سکتا ہے۔ سلطنت کی مضبوطی قلعے اور فصیل سے نہیں، بلکہ بادشاہ کے کردار اور عدل سے ہوتی ہے۔ لوگوں سے اچھا سلوک کیجئے، ان میں سے ہر ایک آپ کے لئے مضبوط قلعہ بن جائے گا۔ حضور والا، تجربہ بتاتا ہے کہ سب سے مضبوط اور نہ ٹوٹنے والی چیز صرف نیکی ہے۔ اور بادشاہ کیلئے سب سے بڑی نیکی عدل ہے۔ عدل سے بڑھ کر کوئی حصار، کوئی قلعہ نہیں۔

☆☆☆☆☆

اصل خزانہ

پرانے وقتوں کا قصہ ہے کہ حاکم وقت سیر و شکار کو نکلا۔ امراء وزراء رکاب میں تھے۔ خدام، ملازمین ساز وسامان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے دفعتاً ایک بڑا ہرن نظر پڑا۔ امیر نے گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا، گھوڑا دوڑتا ہوا بہت دور نکل گیا اور ہمراہیوں سے بچھڑ گیا۔ امیر اسی طرح ہراساں، پریشاں، جنگل میں سرگرداں تھا کہ دور ایک قلعہ نما حویلی پر نظر پڑی۔ اس نے گھوڑے کی باگ ادھر ہی موڑ دی۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ حویلی نہایت شکستہ حالت میں ہے۔ دروازہ ٹوٹا ہوا ہے، فصیل کی دیوار پر کائی جمی ہوئی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا ہمت کر کے آگے بڑھا کہ شاید کوئی اللہ کا

بندہ وہاں ہو جو رات کو سر چھپانے کی جگہ دے دے۔ لیکن وہاں تو آدم تھا نہ آدم زاد۔ شکستہ محل سرا میں اکیلا گھومتا پھرتا تھا۔ دیکھا کہ ایک جگہ ایک ہیرا پڑا جگمگ جگمگ کرتا ہے۔ امیر نے بڑھ کر اٹھا لیا۔ اسے پا کر بہت خوش ہوا۔ وہ بہت قیمتی ہیرا تھا۔ اتنا بڑا ہیرا اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، ادھر دیکھا تو ایک اشرفی پڑی نظر آئی۔ جو آدھی مٹی میں دبی تھی۔ اس نے اس جگہ کو تلوار سے کریدا تو پتہ چلا کہ یہاں تو اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہے۔ اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس کو کسی طرح محل میں لے چلنا چاہیے۔ اتنا بڑا خزانہ پا کر وہ بے چین ہو گیا۔ بھاگ کر باہر آیا کہ کسی کو آواز دے۔ شام ہو رہی تھی۔ دیکھا کہ ایک لکڑ ہارا لکڑیوں کا گٹھا سر پر لئے پگڈنڈی پر چلا آ رہا ہے۔

امیر: میاں لکڑ ہارے، اچھے وقت پر آئے، میرا ایک کام ہے، کر دو گے؟

لکڑ ہارا: آپ تو کوئی بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو ایسا کیا کام آ پڑا۔

امیر: کام ایسا ہے کہ تمہارے بھی دن پھر جائیں گے، وارے نیارے ہو جائیں گے۔

لکڑ ہارا: بتایئے کیا خدمت ہے؟

امیر: ایک خزانے کو رات رات ایک محفوظ مقام پر پہنچانا ہے۔ اس خزانے میں تمہارا بھی حصہ ہو گا، پھر تم زندگی بھر عیش کرنا۔

لکڑ ہارا: آپ کس خزانے کی بات کر رہے ہیں؟

امیر: جسے میں نے تلاش کیا ہے۔

لکڑ ہارا: کہاں، اس حویلی میں تو نہیں؟

امیر: ہاں، لیکن کیا تمہیں اس کی خبر ہے؟

لکڑ ہارا: کیوں نہیں، پچھلی بارشوں میں قلعہ کی ایک دیوار گری تھی، اس میں ایک خزانہ دفن تھا۔ وہ باہر آ گیا ہے۔

امیر: تم نے اسے دیکھا ہے؟

لکڑ ہارا: ہاں، ایک ہیرا تو ایک پتھر کے پاس پڑا ہے۔ ایک دیگ اشرفیوں سے بھری پڑی ہے۔

امیر: کمال ہے، پھر تم نے خزانے کو پڑا رہنے دیا۔

لکڑ ہارا: میرے آقا، میرا خزانہ تو یہ میرے بازو ہیں۔ میں اپنی محنت کی روکھی سوکھی کھاتا ہوں۔ اور چین کی نیند سوتا ہوں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مجھے ہیروں اور سونے کے ڈھیر کا کیا کرنا، جو چیز میری نہیں، وہ میرے لئے پتھر ہے۔ خدا میرے بازوؤں کو سلامت رکھے۔

وہ حاکم وقت کوئی اور نہ تھا، ابراہیم بن ادھمؒ تھے۔ بعد کو انہوں نے تخت و تاج چھوڑا اور درویشی اختیار کی۔

☆☆☆☆☆

دو اللہ والوں کی کہانی

دو اللہ والے تھے، ان کی بزرگی کی دھوم دور دور تک تھی۔ لیکن ہاتھ تنگ تھا۔ صبر و شکر کے ساتھ گزارا کر رہے تھے، ان میں سے ایک کے پاس حاکم شہر نے ایک بیش قیمت خلعت بھیجی۔

ہرکارہ: جناب، آپ کی خدمت میں امیر شہر نے یہ خلعت بھیجی ہے، آپ کو بہت بہت سلام کہا ہے۔ اور درخواست کی ہے کہ آپ اس تحفہ کو قبول فرمائیں۔ یہ آپ کے پہننے کیلئے ہے۔

بزرگ: امیر کو میرا سلام کہنا، شکریہ ادا کرنا، یہ پوشاک بہت قیمتی ہے، کپڑا بھی بہت اچھا ہے۔ اس پر زردوزی کا کام بھی لاجواب ہے، مجھے پسند بھی بہت آئی۔ لیکن میرے معمولی پرانے کپڑے ہی میرے لئے اچھے ہیں۔

ہرکارہ: کہاں اچھے ہیں؟ آپ دیکھتے نہیں ان میں کتنے پیوند لگے ہیں۔

بزرگ: ہاں یہ پیوند لگے بوسیدہ ضرور ہیں لیکن یہ میرے اپنے ہیں۔ ان کے لئے میں نہ کسی کا احسان مند ہوں نہ کسی کے آگے میری نظر جھکتی ہے۔ وہ قیمتی لباس جو میری نگاہیں جھکا دے، میرے کس کام کا۔

دوسرے اللہ والے بھی دور ونزدیک مشہور تھے، بڑے عابد وزاہد بزرگ تھے، امیر ان کا بھی عقیدت مند تھا، کبھی کبھی ان کے ہاں حاضری دیتا تھا۔ اس نے ان کا روزینہ بھی مقرر کر رکھا تھا لیکن وہ اتنا کم تھا کہ بزرگ کے بڑے کنبے کیلئے ناکافی تھا۔ اس وجہ سے پریشان رہتے تھے، ایک روز ایک پرانے دوست آئے۔

دوست: آپ کیوں مصیبت اٹھاتے ہیں؟ امیر آپ کا قدردان ہے، آپ جھوٹے منہ بھی کہہ دیں تو وہ آپ کا وظیفہ بڑھا دے گا۔ اس کے پاس کوئی کمی نہیں۔

بزرگ: کہہ تو دوں، وہ بڑھا بھی دے گا۔ لیکن دل نہیں مانتا۔

دوست: اس میں تکلف کی کیا بات ہے، آپ کونسا ناجائز مطالبہ کر رہے ہیں۔ شاید اسے پتہ نہیں کہ اس کا مقرر کردہ وظیفہ آپ کی ضروریات کیلئے ناکافی ہے۔

بزرگ: اچھا سوچوں گا۔

دوست: ضرورت کی مار بڑی بری ہوتی ہے۔ بزرگ نے ایک روز تنگ آ کر امیر کو پیغام بھیجا کہ صورت حال یہ ہے کچھ دنوں کے بعد وہ دوست پھر آئے۔

دوست: کہئے جناب، اب کیا حال ہے؟

بزرگ: ضرورت سے تنگ آ کر میں نے امیر کو پیغام بھیجا تھا، اس نے وظیفے کی رقم دُگنی کر دی۔

دوست: مبارک ہو، یہ تو بڑا اچھا ہوا، آپ کو بڑی پریشانی تھی۔

بزرگ: لیکن میں بڑا پشیمان ہوں بلکہ پچھتا رہا ہوں۔

دوست: کیوں؟

بزرگ: وظیفہ کی رقم تو امیر نے دُگنی کر دی لیکن میرے یہاں آنا چھوڑ دیا، گزارہ تو بڑھ گیا لیکن عزت گھٹ گئی۔ سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔ خدا معاف کرے بڑی غلطی ہوگئی۔ برسوں کی ریاضت پر پانی پھر گیا۔

☆☆☆☆☆☆

مسلمانوں کی ترقی کا اصل راز

عباسیوں کے عہد خلافت میں مسلمان افریقہ اور ایشیا کی بہت بڑی طاقت بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی تہذیب و ترقی نے ساری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ قسطنطنیہ کے رومی دربار میں ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی کہ مسلمانوں کی طاقت و ترقی کا اصل راز معلوم کیا جائے۔ بحث مباحثہ کے بعد اس مجلس میں طے پایا کہ چند ہوشیار اور قابل آدمیوں کو مسلمانوں کے شہروں میں بھیجا جائے۔ وہ حالات کا جائزہ لے کر رومی دربار میں اپنی رپورٹ پیش کریں۔ چنانچہ چند لائق فائق لوگ سوداگروں کا بھیس بدل کر مسلمانوں کے شہروں کو چل کھڑے ہوئے۔ واپسی پر قیصر روم اور وفد کے سربراہ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

قیصر روم: پہلے اپنے سفر کی روداد بیان کرو۔

رومی عالم: جناب والا، سب سے پہلے میں کپڑوں کے تاجر کا بھیس بدل کر دمشق میں داخل ہوا۔ میرے ساتھ میرا وفادار غلام بھی تھا جس کی ماتحتی میں میرے دوسرے خدمت گار غلام تھے۔ دمشق میں میں نے مسلمان تاجروں کے ساتھ لین دین کیا اور ہر طرح سے پرکھا۔

قیصر روم: لین دین میں تم نے مسلمان تاجروں کو کیسا پایا؟

رومی عالم: مسلمان تاجر لین دین کے کھرے اور بات کے پکے تھے۔ تجارت میں دیانتداری ان کا اصول تھا۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

قیصر روم: کیوں؟

رومی عالم: تجارت کا اصل اصول ہی دیانت داری ہے۔ کاروبار دیانت سے پھلتا پھولتا ہے۔ دنیا کا ہر اچھا تاجر اس اصول کو سمجھتا ہے۔ اور ایمان داری کو بہترین پالیسی کے طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس میں مسلمان اور عیسائی تاجر کی قید نہیں، اس لئے میں نے تجارت میں مسلمانوں کی دیانت داری کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور ان کی ترقی کے راز کی تلاش میں آگے بڑھا۔

قیصر روم: آگے کہاں؟

رومی عالم: دمشق سے میں بغداد آیا۔

قیصر روم: وہاں کیا دیکھا؟

رومی عالم: بغداد میں میں مسلمان عالموں سے ملا، وہاں کے کتب خانے دیکھے، ان کے عملی اور سائنسی کارناموں کا جائزہ لیا۔ لیکن اس سوال کا جواب پھر نہ ملا کہ اسلام کے اتنی تیزی سے پھیلنے اور عوام میں مقبول ہونے کا راز کیا ہے۔

قیصر روم: کیا مسلمانوں کی علمی اور سائنسی ترقی اس سوال کا شافی جواب نہیں؟

رومی عالم: نہیں۔

قیصر روم: کیوں؟

رومی عالم: اس لئے کہ عملی و سائنسی ترقی سے ملک تو فتح ہو سکتے ہیں، دل فتح نہیں ہو سکتے۔ اس لئے میں گوہر مقصود کی تلاش میں اور آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ میں مسلمانوں کے سرحدی شہر حمص تک پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اپنا باقی ماندہ سامان تجارت ایک مسلمان تاجر کے ہاتھ فروخت کیا۔ اس شہر میں خوب گھوما پھرا، ان کی عبادت گاہیں دیکھیں۔ میلے، ٹھیلے، تہوار کے نظارے کئے لیکن وہ راز پھر بھی نہ کھلا۔ مسلمانوں کے مذہب کے اس طرح پھیلنے کا سبب نہ ان کی فوجی طاقت

ہے نہ تجارتی برتری بلکہ اس کا راز کچھ اور ہی ہے جو کم از کم مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

قیصر روم: مسلمانوں کے شہر حمص میں تم نے کیا دیکھا؟

رومی عالم: حمص میں یوں تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ لیکن ایک واقعہ ضرور ایسا پیش آیا جس نے مجھے حیران کر دیا۔

قیصر روم: وہ کیا؟

رومی عالم: وہ مسلمان تاجر جس کے ہاتھ میں نے اپنا باقی سامان تجارت فروخت کیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی جو میں نے اس خیال سے قبول کر لی کہ دیکھیں ان کا کھانا پینا کیسا ہے؟

قیصر روم: پھر کیسا تھا؟

رومی عالم: مسلمان تاجر بہت مالدار تھا، اس نے بڑی شاندار ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ سازوسامان، برتن، کھانا ہر چیز معیاری اور اپنی قسم کی بہترین تھی۔ لیکن میں نے اس شان وشوکت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

قیصر روم: کیوں؟

رومی عالم: اس لئے کہ اس قسم کے ٹھاٹھ باٹھ روپے کے بل پر ہوتے ہیں جو ہم اس سے زیادہ کر سکتے ہیں۔ البتہ اس دعوت میں ایک چیز میں نے ضرور ایسی دیکھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ کم از کم یہ لوگ تہذیب کے آداب سے واقف نہیں۔

قیصر روم: وہ کیسے؟

رومی عالم: وہ یہ کہ جب میں اپنے خادموں اور غلاموں کے ساتھ اس مالدار مسلمان تاجر کے ہاں پہنچا تو اس نے میرے علاوہ میرے غلاموں سے بھی مصافحہ اور معانقہ کیا۔ مجھے بڑا عجیب معلوم ہوا۔ بلکہ اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ کہاں آقا، کہاں غلام، ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہوتا ہے۔ بات یہیں تک رہتی تو چنداں مضائقہ نہ

تھا۔ لیکن جب اس مسلمان تاجر نے میرے غلاموں اور خادموں کو بھی میرے دسترخوان پر بیٹھنے کی دعوت دی تو مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا، یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ حفظ مراتب کا لحاظ ضروری ہے۔ شکر ہے کہ میرے غلاموں اور خادموں نے خود ہی انکار کر دیا اور بڑے ادب سے میرے پیچھے مورچل لے کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے میزبان نے اپنے غلاموں کو دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت دی تو وہ آداب مجلس سے ناواقف بڑی بے تکلفی سے اپنے آقا کی قاب سے کھانے لگے۔ میں حیران پریشان یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ قدرت نے ان لوگوں کو عروج دیا ہے جو آداب مجلس سے بھی واقف نہیں۔ لیکن دعوت کے آخر میں، میں نے جو دیکھا، اس نے مجھے سکتے میں ڈال دیا۔

قیصر روم: وہ کیا بات تھی؟

رومی عالم: میں نے دیکھا، مسلمان تاجر نے اپنے غلام کی کھائی ہوئی روٹی کے ٹکڑے اٹھا لئے اور یہ کہہ کر کھانے لگا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رزق کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ جناب والا، یہ ہے میرے سفر کی روداد، لیکن مسلمانوں کے مذہب کی مقبولیت کا راز کھلنا تھا نہ کھلا۔

قیصر روم: میں اس راز کو پا گیا ہوں۔

رومی عالم: جناب والا، پھر اس راز سے پردہ اٹھائیے۔

قیصر روم: پہلے تم یہ بتاؤ کہ وہ تمہارا وفادار غلام اور دوسرے لوگ جو تمہارے ساتھ سفر پر گئے تھے ان کا کیا حال ہے؟

رومی عالم: حضور والا، مجھے بڑی ندامت ہے کہ ہمارے آدمیوں میں سے بیشتر بھاگ کر مسلمانوں کے علاقے میں چلے گئے ہیں۔ اور مسلمان ہو گئے ہیں۔ حد یہ کہ میرا اپنا وفادار غلام جس پر مجھے بڑا ناز تھا وہ بھی دغا دے گیا۔

قیصر روم: حمص کے مسلمان تاجر کے یہاں جو کچھ تم نے دیکھا وہی مسلمانوں کی ترقی اور

اسلام کی مقبولیت کا راز ہے۔ ان کے دین میں آقا اور غلام، امیر و غریب سب برابر کا درجہ اور حق رکھتے ہیں۔ یہ نہ ہوتا تو تمہارے غلام نہ بھاگتے اور نہ مسلمان ہوتے۔

☆☆☆☆☆

تنہا ایک آدمی کا پانی پی جانا قطعاً مناسب نہیں

330ق م کے موسم بہار میں سکندر ایران کے شکست خوردہ شہنشاہ دارا کا تعاقب کرتے ہوئے شمال میں کوہ دماند اور باب قزوین سے بھی آگے نکل گیا۔ اس کے بعد اسے ایک صحرا سے گزرنا پڑا۔ سکندر کے مجوسی راہنماؤں نے پہلے سے بتا دیا تھا کہ صحرا میں اسے پانی کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پانی کا سخت توڑا پڑ گیا اور پیاس کی شدت سے سوار اور گھوڑے مرنے لگے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود سکندر اور فوج کے اعلیٰ افسروں کیلئے بھی پینے کا پانی نہ رہا۔ ایک پڑاؤ پر رسد اور پانی کے ذمہ دار افسر نے اپنے آدمیوں کو آس پاس کی چٹانوں پر دوڑایا کہ جیسے بھی ہو کہیں پانی کے چشمے کا پتہ لگائیں۔ خاصی تگ و دو کے بعد ایک یونانی سپاہی نے ایک باریک سوتے کا سراغ لگایا اور سکندر کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنے خود میں پانی بھر کر سکندر کے سامنے لایا۔ شام کا وقت تھا۔ سکندر کے خاص دستے کے سینکڑوں مقدونی جانباز اس کے آس پاس کھڑے تھے اور پیاس سے بے حال ہو رہے تھے۔ خود میں پانی دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ جب اس سپاہی نے سکندر کو پانی بھرا خود پیش کیا تو یہ مکالمہ ہوا۔

سکندر: یہ تم کس کیلئے لائے ہو؟

سپاہی: جناب، آپ کیلئے۔

سکندر: (پانی ریت پر گراتے ہوئے) جب اتنے بہت سے لوگ پیاسے ہوں تو تنہا ایک آدمی کا پانی پینا قطعاً مناسب نہیں۔

ہیرالڈ ولیم نے یہ مکالمہ اپنی کتاب سکندر اعظم میں نقل کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

مانگنے والوں سے کیا مانگوں

ایک پرانی کہانی ہے کہ قدیم ایران کا ایک بادشاہ بہرام ایک روز پورے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار کو نکلا۔ لیکن ایک ہرن کا پیچھا کرتے کرتے بہت دور نکل گیا اور ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ جب شام ہوئی اور سورج مغرب میں ڈوبنے لگا تو صحرا میں اپنے آپ کو یکہ وتنہا پایا۔ فکرمند ہوا کہ رات کہاں گزارے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ایک پہاڑی کے دامن میں ایک جھونپڑے سے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ اس امید میں کہ وہاں کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا جو اسے رات بھر کیلئے پناہ دے سکے، اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آن کی آن میں جھونپڑے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جھونپڑے میں ایک گڈریا رہتا تھا۔ اس سے بہرام نے کہا، بابا، میں ایک شکاری ہوں، ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں، اگر رات کی رات پناہ دے دو تو بڑی مہربانی ہو۔ گڈریئے نے پناہ دے دی اور جو روکھی سوکھی تھی وہ بھی پیش کی۔ صبح سویرے جب بہرام گڈریے سے رخصت ہونے لگا تو اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنے ہاتھ سے ایک انگوٹھی اتار کے اس کے حوالے کی اور کہا، جب کوئی مشکل پیش آئے تو شاہی محل میں آ کر دربان کو انگوٹھی دکھانا، دربان تمہیں میرے پاس لے آئے گا۔ پھر میں تمہاری مشکل حل کروں گا۔ بہرام نے گڈریے کو یہ نہیں بتایا کہ میں خود بادشاہ وقت ہوں۔ بہرحال گڈریے کو اتنا ضرور اندازہ ہوگیا کہ ضرور کوئی امیر یا بارسوخ آدمی ہے جب ہی تو اتنے دعوے سے کہتا ہے کہ تم اپنی مشکل لے کر میرے پاس آنا میں تمہاری مشکل دور کروں گا۔

اتفاق دیکھئے کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گڈریے پر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کیا کرے کیا نہ کرے۔ یکایک امیر شکاری کی دی ہوئی انگوٹھی یاد آئی۔ سوچا، کیوں نہ اسے آزماؤں۔ شاید کچھ بات بنے۔ یہ سوچ کر وہ انگوٹھی لے کر محل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ جوں، اس نے انگوٹھی دربان کو دکھائی وہ چونک پڑا۔ بہرام نے آتے ہی حکم دے دیا تھا کہ جوں ہی کوئی میری خاص انگوٹھی لے کر آئے، اسے شاہی مہمان سمجھا جائے اور اسی لحاظ سے اس کی عزت و تکریم کی جائے۔ اور اسے فوراً میرے حضور پیش کیا جائے دربان نے کہا، تم کون ہو، یہ انگوٹھی تو بادشاہ کی ہے، گڈریے نے کہا، بھائی میں ایک غریب گڈریا ہوں، آپ کے آقا نے آنے کو کہا تھا، تو آ گیا ہوں۔ دربان بولا، آج آپ شاہی مہمان ہیں، بادشاہ کا حکم ہے کہ آپ کو فوراً بادشاہ کے حضور پیش کیا جائے۔ اس لئے آپ میرے ساتھ چلیئے، بادشاہ اس وقت خلوت خانے میں ہے۔

جب گڈریا وہاں پہنچا تو بادشاہ مصلے پر بیٹھا ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا تھا۔ دعا کے بعد دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

گڈریا: کیا تو بہرام بادشاہ نہیں؟

بہرام: ہاں بہرام میں ہی ہوں۔

گڈریا: کیا تو نے میری مشکل دور کرنے کو نہیں کہا تھا؟

بہرام: ہاں، کہا تھا، ضرور کہا تھا۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں، جو مانگو گے، دوں گا۔

گڈریا: کیا تو بھی کسی سے کچھ مانگتا ہے۔

بہرام: ہاں، اپنے اللہ سے جو حقیقی بادشاہ ہے۔

گڈریا: پھر تو میں کنگال کو حاجت روا سمجھ کے آ گیا ہوں، مانگنے والوں سے کیا مانگوں؟

☆☆☆☆☆

ہم تو تمہارے ذوق طلب کے قدردان ہیں

اپنی کتاب ''لبیک'' میں ممتاز مفتی نے تذکرہ غوثیہ کے حوالے سے ایک پرانی حکایت نقل کی ہے۔ ایک بار بادشاہ مصر کے شاہی نوادرات میں کوئی نادر چیز گم ہوگئی۔ وہ چیز نادر و نایاب ہی نہیں، بادشاہ کی پسندیدہ چیز بھی تھی۔ محل میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بادشاہ نے اپنے غلاموں سے کہا، تم میں جو بھی اسے ڈھونڈ کے لائے گا خلعت و نقد انعام پائے گا۔ یہ سننا تھا کہ سارے غلام حرکت میں آگئے۔ محل کا چپہ چپہ چھان مارا، گوشہ گوشہ دیکھ ڈالا، آخرکار ایک غلام نے وہ گوہر مراد پایا اور بھرے دربار میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ پانے والا غلام بہت خوش تھا۔ اس کی مسرت اس کے چہرے سے چھپائے نہ چھپتی تھی۔ اسے امید تھی کہ آج اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ دوسرے ڈھونڈنے والے غلام بھی دربار میں دست بستہ حاضر تھے لیکن سخت اداس تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ وہ مایوس ہی نہیں، شرمندہ سے بھی تھے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے ناکام غلاموں سے کہا،

بادشاہ: تم سب ملول کیوں ہو؟ طلب اور تلاش میں تو تم سب برابر ہو، صرف دریافت سے محروم ہو اور دریافت ایک اتفاقیہ امر ہے، اس لئے کہ چیز صرف ایک تھی اور کسی ایک ہی کو ملنی تھی۔

چیز یافتہ غلام: حضور، اس لحاظ سے مجھ میں اور ان سب میں کیا فرق رہ گیا۔

یہ سن کر بادشاہ نے وہ چیز اٹھا کر زمین پر دے ماری کہ ریزہ ریزہ ہوگئی۔ پھر وہ بولا:

''تم میں اور ان سب میں صرف اس چیز کا فرق تھا، سو مٹ گیا۔ اس چیز کے ہونے نہ ہونے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

ہم تو صرف تمہارے ذوق طلب کے قدردان ہیں۔''

☆☆☆☆☆

باب سوم

متفرقات

مجھے موت چاہیے

آن کو جان پر ترجیح دینے والے جواں مرد، ہر قوم میں اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آن پر جان دے دیتے ہیں لیکن ان کی جواں مردی کی کہانی ان کو امر بنا دیتی ہے۔ دنیا عزت سے مرنے والوں کو ہمیشہ عزت سے یاد کرتی ہے۔

ایک ایسا ہی جواں مرد جموقا تھا، خان اعظم چنگیز خان کا لنگوٹیا۔ دونوں ساتھ ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔ گھوڑ سواری اور نیزہ بازی کی تھی۔ پھر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا، قبائلی عصبیت نے کچھ ایسا رنگ دکھایا کہ دونوں میں ٹھن گئی۔ جموقا کا داؤ پہلے چلا، اس نے خان اعظم کے ستر بہادر سپاہیوں کو مروا دیا۔ اور مروایا بھی کیسے، ابلتے ہوئے تیل میں ڈلوا کر۔ یہ وحشت ناک خبر خان اعظم چنگیز خان تک پہنچی تو تلملا اٹھا۔ اس کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے گھوڑے کی دم کے بالوں سے بنے ہوئے پرچم کو ہوا میں لہرایا۔ اور غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ جموقا کو زندہ یا مردہ حاضر کیا جائے۔

منگول سرداروں کو خان اعظم کے غصے کی آگ کا پتہ تھا کہ جب بھڑکتی ہے تو کیا رنگ لاتی ہے۔ خان اعظم کے خاص دستے کے سردار نے پرچم کو ہاتھ لگایا اور پھر گھوڑے کو ایڑ لگا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوا ہو گیا۔ چند روز کے بعد جموقا خان اعظم کے خیمے کے آگے کھڑا تھا۔ لوگوں کو یہ اندازہ لگانے کی ضرورت نہیں تھی کہ جموقا کا انجام کیا ہوگا۔ وہ تو یہ سوچ رہے تھے کہ خان اعظم اپنے انتقام کی آگ بجھانے کا کھولتے تیل سے زیادہ اذیت ناک کونسا طریقہ ڈھونڈے گا۔ چونکہ خان اعظم کو خیمے سے برآمد ہونے میں دیر ہو رہی تھی اس لئے ان کا تخیل سزا کا ہر امکانی طریق تصور کر رہا تھا۔

لیکن جب خان اعظم خاں خیمے سے برآمد ہوا تو اس کے چہرے پر انتقام کے وہ خوفناک سائے نہیں تھے، جن کی حاضرین کو توقع تھی۔ نامعلوم اسباب کی بناء پر آج خان اعظم، وہ بھی اس موقع پر پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے جموقا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

چنگیز خان: جموقا، کبھی تم میرے دوست تھے، بچپن ہم نے ایک ساتھ گزارا ہے۔ لیکن تم نے میرے خلاف تلوار اٹھائی اور میرے ستر بہادروں کے ساتھ تم نے جو سلوک کیا، وہ دنیا خوب جانتی ہے۔ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں تمہارے ساتھ کیا

سلوک کروں؟

جموقا: وہی خان اعظم جو ایک دشمن دوسرے دشمن کے ساتھ کرتا ہے۔

چنگیز خان: کیا مطلب؟ کیا تم نہیں جانتے کہ خان اعظم اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟

جموقا: میں خوب جانتا ہوں۔ خان اعظم کو میں نہ سمجھوں گا تو کون سمجھے گا۔

چنگیز خان: تو پھر کیا چاہتے ہو؟

جموقا: عزت کی موت۔

خانِ اعظم چنگیز خان، جس کی ہیبت کے آگے مشرق ومغرب کے سلاطین کانپتے تھے، آج ایک ایسے دشمن کے آگے بے بس کھڑا تھا جس کو جان کی پرواہ نہیں تھی۔ چنگیز خان نے جلاد کو اشارہ کر کے جموقا کی خواہش کا احترام کیا اور خود آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا خیمے کے اندر چلا گیا جس پر یاک کے سات دموں والا پرچم لہرا رہا تھا۔

ناقابل شکست چنگیز خان آج ایک ایسے دشمن سے شکست کھا گیا تھا، جس نے جان کی امان کی درخواست نہ کر کے اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

سچ ہے بزدلی کی بنیاد جان کی بے جا محبت ہے۔ جو لوگ آن کو جان پر ترجیح دیتے ہیں وہ ناقابل تسخیر ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سکندر اعظم کا استاد

سکندر اعظم جب یونان کا فرمانروا بنا اور بڑے بڑے ملک فتح کیے تو جشن فتح میں اس نے اپنے استاد ارسطو کی اس طرح تعظیم کی کہ اس کے استقبال کیلئے پاپیادہ نکل کے آیا اور استاد کی سواری کے ساتھ چلتا رہا۔ اور اس کو بڑی عزت وتکریم سے اتارا۔ اور اپنی مسند پر جگہ دی۔ جشن

کے بعد چند درباری اس واقعہ پر گفتگو کر رہے تھے۔

پہلا درباری: تم نے دیکھا، جہاں پناہ نے جشن میں ارسطو کی کس طرح تعظیم و تکریم کی۔

دوسرا درباری: ہاں، میں بھی دیکھ کر حیران ہوا۔ بڑے بڑے تجربہ کار جرنیلوں کو نوجوان سکندر کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں۔

پہلا درباری: تم جرنیلوں اور امیروں کی بات کرتے ہو، اتنی عزت تو سکندر نے اپنے باپ فیلقوس کی بھی نہیں کی۔

دوسرا درباری: واقعہ تو یہی ہے، سکندر، سکندر ہی ہے، اس کی ہر بات نرالی ہے۔

(سکندر آتا ہے)

سکندر: معزز دوستو، کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

درباری: ہم جشن فتح کے سب سے اہم واقعہ کی بات کر رہے تھے۔

سکندر: کونسا اہم واقعہ؟

درباری: آپ کے استاد ارسطو کا واقعہ۔

سکندر: استاد مکرم کو کیا ہوا؟

درباری: ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جشن فتح میں آپ نے اپنے استاد ارسطو کی ایسی تعظیم کی کہ شاید آپ نے والد کی بھی کبھی اس طرح تعظیم نہ کی ہوگی۔

سکندر: دوستو، استاد کی یہ عزت بے وجہ نہیں۔ میرے باپ نے مجھے وہ زندگی دی جو فانی ہے اور میرے استاد نے مجھے وہ زندگی دی جو باقی رہے گی اور فنا نہ ہوگی۔

☆☆☆☆☆

شجاعت ہی میں نہیں، شرافت میں بھی طاق

دنیا میں بہت تھوڑے ایسے آدمی گزرے ہیں جن کے نام کو زمانہ کی گرد نے مٹایا نہیں بلکہ شب و روز کی گردش نے چمکایا ہے۔ مقدونیہ کے حاکم فیلقوس کا بیٹا سکندر، جسے دنیا سکندراعظم کے نام سے جانتی ہے، ایسا ہی یکتا و یگانہ انسان تھا۔

وہ جتنا شجاعت کیلئے مشہور تھا، اس سے زیادہ شرافت کیلئے ممتاز تھا۔ دارا کے خلاف ایران کی جنگ میں اس نے شجاعت کے خوب جوہر دکھائے۔ اس کے سپہ سالاروں اور سپاہیوں نے بھی اپنی دلاوری اور دلیری کا سکہ جمایا۔ اور جب میدان مار چکے، اور جب دارا کا تخت و تاج سکندر کے قدموں میں پڑا تھا، تو چوٹی کے سپہ سالاروں نے سکندر سے درخواست کی کہ کچھ انہیں بھی اپنی حسرتیں نکالنے کا موقع دیا جائے۔ ان کی حسرتوں کی آماجگاہ زر و جواہر کے خزانے اور مال غنیمت کے انبار ہی نہیں تھے، ان کی نگاہ ہوس شاہی خاندان اور ایرانی امراء کے محلوں کے ان چاند تاروں پر بھی تھی جن کے حسن و جمال کے قصے وہ داستانوں میں سنتے آئے تھے۔ اور جو اب مال غنیمت کے طور پر ان کے سامنے تھے۔

سکندر کو خوب معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک فاتح فوج کی ناز برداری کتنی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جو جواب اس نے اپنے اعلیٰ سپہ سالاروں کو دیا وہ آج بھی اس کے نام کو اونچا رکھنے کیلئے کافی ہے۔ اس نے کہا،

"میرے دوستو، ہم ایران کے تاج و تخت کی جستجو میں آئے تھے، ایرانی عورتوں کی تلاش میں نہیں۔ ان مفتوحہ علاقوں کی عزت و حرمت اب ہماری ذمہ داری ہے۔"

سکندر کس عزم و حوصلے کا آدمی تھا اس کا اندازہ اس مکالمے سے ہوتا ہے جسے مشہور مورخ پلوٹارک نے اپنی کتاب سکندر کے باب میں تاریخ کیلئے محفوظ کر دیا ہے۔

لڑائی سے پہلے دارا نے سکندر کو صلح کی پیش کش کی، تحائف ارسال کئے سکندر کا سپہ سالار پارمینو پاس کھڑا تھا۔

پارمینو: دارا کی طرف سے صلح کی پیشکش قابل غور ہے۔

سکندر: مجھے اس میں دلچسپی نہیں۔

پارمینو: غور کیجئے، اتنا وسیع و عریض علاقہ، اتنے زر و جواہر اور پھر دارا اپنی بہن کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہے۔ یہ سب کچھ بغیر ایک تلوار اٹھائے مل رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ صلح کی یہ پیش کش بہت اچھی ہے، اگر میں سکندر ہوتا تو یہ ضرور پیشکش قبول کر لیتا۔

سکندر: میں بھی اس پیشکش کو ضرور قبول کر لیتا اگر میں محض پارمینو ہوتا۔

یہ جواب دینے کیلئے سکندر کا سا دل و جگر چاہیے۔ یہ وہی سکندر تھا جب لڑکپن میں اس نے دیکھا کہ اس کا باپ فتح پہ فتح حاصل کرتا جا رہا ہے تو اس نے کہا۔

"واحسرتا، میرا باپ یوں ہی فتوحات حاصل کرتا رہا تو میرے لئے فتح کرنے کو کیا رہ جائے گا؟"

☆☆☆☆☆

عدل شیر شاہی کے دو واقعات

فرید خان، جو تاریخ میں شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہے، جب ہمایوں کو شکست دے کر تخت پر بیٹھا تو اس نے شیر شاہ سلطان العادل کے نام سے سکہ جاری کیا۔

شیر شاہ نے ہر علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کیلئے اپنے خصوصی اہلکار مقرر کئے تھے جو شقدار کہلاتے تھے۔ ہر شقدار اپنے علاقے میں امن و امان کا ذمہ دار تھا۔ اگر کوئی جرم ہوتا اور مجرم نہ پکڑا جاتا تو اس علاقے کے شقدار کو سزا کا سزاوار سمجھا جاتا۔

ایک بار ایک دور دراز علاقہ میں قتل ہوا۔ فریادی شیر شاہ کے پاس آیا۔ شیر شاہ نے شقدار کو تفتیش کیلئے لکھا۔ شقدار نے گول مول جواب دیا۔ شیر شاہ نے اسی وقت چند سپاہیوں کو ساتھ لیا۔ اور بھیس بدل کر اس علاقے میں پہنچ گیا۔ اور اس بستی کے قریب جنگل میں جا کر، جس میں شقدار رہتا تھا، ایک درخت کو کاٹنے لگا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، کہ شقدار آن پہنچا۔

شقدار: خبردار، درخت نہ کاٹو۔

شیرشاہ: کیوں کیا ہے؟ تم کون ہو مجھے منع کرنے والے؟

شقدار: میں شیرشاہ سلطان العادل کا کارندہ اس علاقے کا شقدار ہوں۔ تم مجھے نہیں پہچانتے۔ شاید تم اس علاقے میں اجنبی ہو۔

شیرشاہ: ہاں بھائی، اجنبی ہوں، مجھے خبر نہیں کہ تم کون ہو۔ لکڑی کی ضرورت تھی، کاٹنے لگا۔

شقدار: تم کو معلوم نہیں کہ لکڑی بغیر اجازت کاٹنا جرم ہے۔

شیرشاہ: مجھے معلوم نہ تھا، لو اب نہیں کاٹتا، معافی دے دو۔

شقدار: معافی اس طرح نہ ہوگی، اس علاقے میں امن و امان اور سرکاری املاک کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ چلو، میرے ساتھ چلو، میں تمہیں قرار واقعی سزا دوں گا۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ یہ شیرشاہی دور ہے۔ پرانا زمانہ گزر چکا جب نابکار، بدمعاش اپنی من مانی کرتے تھے۔

شیرشاہ: چلتا ہوں، بابا، چلتا ہوں، جو چاہے سزا دو، پر بھائی اتنا تو بتا دو کہ ابھی زیادہ دن بھی نہیں چڑھا، جنگل ہے، لوگ باگ آتے جاتے بھی نہیں، پھر تمہیں پتہ کیسے چلا کہ میں یہاں درخت کاٹ رہا ہوں۔

شقدار: (قہقہہ لگا کر) اب تمہیں یہ راز بھی بتا دیں۔ بچو، اس علاقے میں پتہ بھی کھڑکتا ہے تو مجھے خبر ہو جاتی ہے۔ اگر اتنا نہ ہو تو شقدار کس بات کے ہوئے۔

شیرشاہ کے جاسوس گاؤں گاؤں ہیں اور میرے مخبر چپے چپے پر۔

شیرشاہ: بہت خوب، بہت خوب، پھر تو تم بڑے زبردست شقدار ہو۔

شقدار: زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ سیدھے سیدھے چلے آؤ۔

شیرشاہ: تو پھر دیکھو (بھیس اتار دیتا ہے)

شقدار: کون؟ شیر شاہ سلطان العادل جہاں پناہ، جہاں پناہ۔

شیرشاہ: شقدار، میں تمہاری چوکسی اور ہوشیاری کی داد دیتا ہوں۔ لیکن صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس علاقے میں پتہ کھڑکتا ہے تو تمہیں خبر ہو جاتی ہے۔ درخت کی ایک شاخ کوئی کاٹتا ہے تو تم اسے گردن سے پکڑ لیتے ہو۔ اور ایک بندۂ خدا کا خون ناحق بہتا ہے، ایک مظلوم عورت کا بیٹا قتل ہوتا ہے اور تمہیں خبر نہیں ہوتی، قاتل اسی علاقے میں ہے، جاؤ اور اسے پکڑ کر لاؤ، ورنہ کل صبح اسی پیڑ سے تمہاری لاش لٹکتی ہوگی۔

کتابوں میں ہے کہ مہلت کی مدت میں شقدار نے مجرم کو پکڑ کر شیر شاہ کے حضور پیش کر دیا۔ شیر شاہ عدل و انصاف کرنے میں دیر نہ لگاتا تھا، نہ کسی سے رعایت کرتا تھا۔ یہ عدل کی شان تھی۔

شیر شاہ کے بے لاگ عدل کا ایک اور واقعہ بھی تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ آگرہ کے قریب ایک ہندو نے دربار شیر شاہ میں شکایت کی۔

فریادی: آپ پرجا کے مائی باپ ہیں، ہماری عزت و آبرو کے محافظ ہیں۔

شیرشاہ: اس میں کیا شک ہے۔

فریادی: ہماری بہو بیٹیاں، آپ کی بہو بیٹیاں ہیں۔

شیرشاہ: یہ بھی صحیح ہے، تم چاہتے کیا ہو؟

فریادی: میں بے عزت ہوا ہوں، میری گھر والی بے عزت ہوئی ہے، انصاف چاہتا ہوں۔

شیرشاہ: شیر شاہ کو انصاف کرنا آتا ہے۔

فریادی: خواہ ملزم کوئی بھی ہو؟

شیرشاہ: ہاں اس میں کیا شک ہے، تم کہو، کیا بات ہے، کیا کوئی بڑی با اثر شخصیت ملوث ہے؟

فریادی: جی ہاں، بہت بڑی۔

شیر شاہ: وہ کون؟

فریادی: شہزادہ عادل خان۔

شیر شاہ: ہمارا شہزادہ عادل خان؟ کیا کیا اس نے؟

فریادی: ہم لوگ آگرہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ گاؤں کے گھر کچے ہیں، دیواریں نیچی ہیں۔ پچھلے ہفتے شہزادہ صاحب شکار پر جاتے ہوئے ہاتھی پر سوار بغیر اعلان اور اطلاع کے گاؤں سے گزرے۔ میری بیوی آنگن میں بے خبر نہا رہی تھی۔ شہزادہ نے اپنے ہاتھی کو کچھ دیر وہاں روکے رکھا، ظاہر ہے کہ کیوں روکے رکھا۔ گاؤں میں اس بات کا چرچا ہے، میں بے عزت ہوا ہوں، میری گھر والی بے عزت ہوئی ہے۔

شیر شاہ: اور شیر شاہ بھی بے عزت ہوا ہے۔ ہم اپنی بہو سے معافی چاہتے ہیں، اور ابھی تمہارے روبرو فیصلہ کرتے ہیں۔

چنانچہ شیر شاہ کے حکم پر شہزادہ عادل خان کو باپ کے سامنے ایک عام ملزم کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔

شیر شاہ: ملزم، عادل خان کو الزام کی نوعیت کا علم ہے؟

عادل خان: مجھے علم ہے۔

شیر شاہ: تمہیں واقعہ کی صحت کا اقرار ہے؟

عادل خان: انکار بھی نہیں۔

شیر شاہ: انکار نہیں تو اقرار ہے۔ جرم ثابت ہوتا ہے۔

ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ شہزادہ کی بیوی اسی طرح اس گھر میں ہو اور مدعی شہزادے کی طرح ہاتھی پر سوار وہاں سے گزرے اور اسی طرح ہاتھی کو وہاں ٹھہرائے۔

فریادی: مجھے انصاف مل گیا، میں شہزادے کو معاف کرتا ہوں۔

یہ تھا شیر شاہ سلطان العادل۔ ہند کے بت کدے میں مسلمانوں نے تقریباً ہزار سال حکومت کی۔ وہ بے انصاف ہرگز نہیں تھے۔ شیر شاہ کے بعد عظیم مغلوں کا انصاف بھی مشہور ہے۔ تزک تیموری میں ہے کہ ملک کفر سے قائم رہ سکتا ہے، ظلم سے نہیں۔ یہ ایک ابدی اصول ہے جو اس وقت بھی صحیح تھا اور آج بھی صحیح ہے۔

☆☆☆☆☆

سقراط کے آخری لمحات

سقراط کو فلسفہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ وہ مفکر ہی نہیں مصلح اخلاق بھی تھا اور تلوار کا دھنی بھی۔ لیکن ایتھنز کی حکومت کی آنکھوں میں وہ کھٹکتا تھا۔ 399 قبل مسیح میں حکومت ایتھنز نے اسے موت کی سزا سنائی۔ اس کا جرم کیا تھا؟ حق گوئی و بے باکی!

سقراط قید خانے میں موت کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کا چہیتا شاگرد کریٹو اس کے پاس آیا۔

کریٹو: مکرم و محترم دانش ور! حالات بہت سازگار ہیں، ہم نے ضروری انتظامات کر لئے ہیں۔

سقراط: کس بات کیلئے؟

کریٹو: اس قید سے نجات حاصل کرنے کیلئے۔

سقراط: فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

کریٹو: فیصلہ ابھی اپنی جگہ قائم ہے، ہم نے ایسے انتظامات کئے ہیں کہ آپ آسانی سے یہاں سے فرار ہو کر ایتھنز سے باہر جا سکتے ہیں۔

سقراط: کریٹو، میرے عزیز، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا میں اپنی حکومت کے قانون کو توڑوں؟

کریٹو: لیکن جناب، حکومت کے گیارہ آدمیوں کی جیوری نے آپ کے ساتھ کون سا انصاف کیا ہے۔ آپ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔

سقراط: یہ صحیح ہے کریٹو، میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ عدالت نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

کریٹو: تو پھر کیا آپ کو اس قید خانے سے فرار ہونے کا حق نہیں پہنچتا؟

سقراط: نہیں۔

کریٹو: کیوں؟

سقراط: اس لئے کہ ریاست کی قانونی عدالت کے فیصلے کی پابندی ہر شہری پر لازمی ہے۔ خواہ وہ فیصلہ سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ یہ ایک اصول کی بات ہے اس لئے اے میرے ہمدرد، غمگسار کریٹو، میں اس قید خانے سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

سقراط کے اس انکار سے آخر وہ دن آ پہنچا جب اسے زہر کا پیالہ پینا تھا۔ اس دن بھی سقراط نے بڑے اطمینان سے اپنے دوستوں اور شاگردوں سے باتیں کیں۔ اس روز اس کی گفتگو کا موضوع کچھ اور نہیں بقائے روح کا مسئلہ تھا۔ لیکن اس کے سامعین اس خیال سے بے چین اور ملول تھے کہ کچھ دیر کے بعد، رشد وہدایت کا چراغ گل ہونے والا ہے۔ وہ اپنی محرومی کے خیال سے حد درجہ افسردہ تھے۔ لیکن سقراط کے اطمینان وسکون میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بقائے روح کے مسئلہ پر اظہار خیال کرنے کے بعد سقراط اٹھا، غسل خانے میں جا کر غسل کیا، واپس آ کر اپنے بچوں سے ملا۔ گھر کی عورتوں سے کچھ باتیں کیں۔ انہیں کچھ سمجھایا اور پھر اپنے دوستوں اور شاگردوں کے پاس آ گیا اور ان سے اِدھر اُدھر کی عام باتیں کرنے لگا۔

اب غروب آفتاب کا وقت قریب آنے لگا تھا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ سزا کی تکمیل میں زیادہ دیر نہیں۔ اتنے میں جیلر اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

جیلر: میں جانتا ہوں کہ سقراط تم ان سب لوگوں میں، جو آج تک یہاں آئے ہیں، سب سے زیادہ شریف، نیک اور حلیم ہو، تم سے مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ مجھ سے ناراض ہو گے، ان دوسروں کی طرح جو مجھ پر جھنجھلاتے ہیں اور مجھے برا بھلا کہتے ہیں۔ جب حاکموں کے حکم کے مطابق میں ان سے زہر پینے کو کہتا ہوں، مجھے یقین ہے تم مجھ سے خفا نہ ہو گے۔ اس لئے کہ تم جانتے ہو کہ قصور دوسروں کا ہے، میرا نہیں، اچھا اب خدا حافظ، تم جانتے ہو کہ میں غروب آفتاب کے وقت کس لئے آیا ہوں۔

سقراط: میں تمہاری ہمدردی کیلئے تمہارا شکرگزار ہوں، میں تمہارے اشارے کو سمجھتا ہوں، میں تیار ہوں۔

جیلر: اچھا۔ (روتے ہوئے باہر چلا جاتا ہے)۔

سقراط: کریٹو، دیکھو کتنا اچھا آدمی ہے۔ جب سے میں یہاں قید ہوا ہوں ہر روز میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے دلجوئی کی باتیں کرتا ہے۔ بڑی اچھی طرح پیش آتا ہے۔ اور جو خدمت اس کے اختیار میں تھی وہ بجا لاتا رہا ہے۔ اب دیکھو کتنے خلوص سے میرے لئے آزردہ ہو رہا ہے، میرا خیال ہے ہمیں اس کا کام آسان کرنا چاہیے۔ کریٹو، اس سے جا کر کہہ دو کہ اگر زہر کا پیالہ تیار ہے تو لے آئے۔

کریٹو: میرے آقا، ابھی تو سورج پہاڑ کی چوٹی پر موجود ہے، مجھے معلوم ہے کہ عموماً لوگ زہر پینے میں ہر ممکن دیر کرتے ہیں اور پیالہ تیار ہونے کی خبر ملنے کے بعد بھی اپنی حسرتیں پوری کرتے رہتے ہیں، کہ زندگی کے آخری لمحہ تک کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ میرے معلم، میرے مربی تم بھی جلدی نہ کرو۔ ابھی کافی وقت، کافی وقت ہے۔

سقراط: ہاں کریٹو، جن لوگوں کا تم ذکر کر رہے ہو وہ ایسا کرتے ہیں تو ٹھیک ہے، اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دیر کرنے میں ان کا فائدہ ہے، مگر میرے لئے ان کی تقلید کرنا بے سود ہے۔ تھوڑی سی دیر کر لینے سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔ مجھے خود اپنے اوپر ہنسی آئے گی کہ جو جان پہلے ہی جا چکی ہے اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کریٹو، میرے ہمدم، میرے دوست، مہربانی کر کے جو میں کہتا ہوں وہی کرو اور میری درخواست رد نہ کرو۔

افلاطون نے مکالمات میں لکھا ہے کہ کریٹو نے نوکر کو جو قریب کھڑا تھا، اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد جیلر کے ساتھ زہر کا پیالہ لئے ہوئے واپس آیا تو سقراط نے جیلر سے کہا۔

سقراط: میرے اچھے دوست، ان معاملات میں تم تجربہ رکھتے ہو، مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟

جیلر: تم صرف یہ کرو کہ پیالہ پی کر اس وقت تک ٹہلتے رہو جب تک تمہاری ٹانگیں بھاری نہ ہو جائیں اور پھر لیٹ جاؤ اور زہر کو آہستہ آہستہ اثر کرنے دو۔

سقراط: ٹھیک ہے، لاؤ پیالہ مجھے دو۔ (پیالہ ہاتھ میں لے کر)

ہاں، میرے دوست اس بارے میں کیا خیال ہے کہ میں اس میں سے چند قطرے دیوتاؤں کے نام پر زمین پر گرا دوں، جیسا کہ رسم ہے کہ کوئی مشروب پینے سے پہلے دیوتاؤں کو نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔

جیلر: سقراط، ہم صرف اتنا ہی زہر تیار کرتے ہیں جتنا ضروری ہوتا ہے۔

سقراط: ٹھیک ہے، میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن اس کی تو اجازت ہوگی کہ میں دیوتاؤں سے دعا کروں کہ وہ مجھے خیریت کے ساتھ اس دنیا سے اس دنیا میں لے جائیں۔

یہ کہہ کر سقراط نے پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور ہنسی خوشی دیکھتے ہی دیکھتے سارا

زہر پی لیا۔ یوں جیسے کوئی پیاسا ٹھنڈا پانی پی رہا ہو۔

لیکن سقراط کے شاگردوں اور عقیدت مندوں سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے آنسو بہنے لگے۔ جب ان میں سے ایک کی چیخ نکلی تو سقراط نے کہا۔

سقراط: یہ آواز کیسی تھی؟ میں نے عورتوں کو اسی لئے رخصت کر دیا تھا کہ وہ شاید ضبط نہ کر سکیں۔ دوستو انسان کو سکون سے مرنا چاہیے، اس لئے خاموش رہو اور صبر کرو۔

یہ کہہ کر سقراط کچھ دیر تک ٹہلتا رہا۔ جب ٹانگیں بھاری ہونے لگیں تو وہ ہدایت کے مطابق فرش پر لیٹ گیا اور اوپر کمبل اوڑھ لیا۔ وہ شخص جس نے اسے زہر کا پیالہ دیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد اس کے پاؤں اور ٹانگوں کو چھو چھو کر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سقراط کے پاؤں کو زور سے دبایا۔

جیلر: اب کچھ محسوس ہوتا ہے؟

سقراط: نہیں۔

جیلر: اور یہاں، گھٹنے سے اوپر؟

سقراط: بہت کم۔

جیلر: اور اب؟

سقراط: بالکل نہیں۔

جیلر: (کچھ دیر بعد) یہاں؟

سقراط: نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ زہر آہستہ آہستہ اثر کر رہا ہے۔ میں کمر تک سن ہو چکا ہوں۔ جب زہر قلب تک پہنچ جائے گا تو کام ختم ہو جائے گا۔

اور ہاں کریٹو، کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

کریٹو: جی، میرے مربی، میرے آقا میں گوش برآواز ہوں۔

سقراط: مجھے یاد آیا۔ میں نے دیوتاؤں کے نام پر ایک مرغ دینے کی منت مانی تھی، تم یاد کر کے اسے پورا کر دینا۔

کریٹو: ضرور ضرور۔ اور تو کچھ نہیں کہنا ہے، آپ کو؟

سقراط نے اس سوال کا جواب نہیں دیا، ایک دو لمحوں کے بعد اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ کریٹو نے کمبل کھینچ کر اس کے سر کو ڈھک دیا۔

سقراط مر گیا۔ سقراط زندہ ہے۔ کریٹو نے آہستہ سے کہا۔

☆☆☆☆☆

''بیٹا! پہلے نماز پڑھ لو، پھر باتیں کریں گے''

اردو کے مشہور ادیب و نقاد، سید ابوالخیر کشفی روزنامہ جنگ میں اپنے کالم ''سچ کی صلیب'' (مورخہ 3 جولائی 1980ء) میں لکھتے ہیں۔

یہ 1954ء کی بات ہے کہ میں کانپور جاتے ہوئے امرتسر کے سٹیشن پر کلکتہ میل کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی میں ایک دو نہیں پورے چھ گھنٹے کی دیر تھی۔ سوچ رہا تھا کہ یہ وقت کیسے گزاروں۔ یکا یک خیال آیا کہ امرتسر میں کہیں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ رہتے ہیں۔ کیوں نہ ان سے مل آؤں۔ ان سے والد صاحب کے بھی بڑے تعلقات رہے تھے۔ اور میں خود بھی ان کی تنقیدیں اور نظمیں شوق سے پڑھتا رہا تھا۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ بہرحال ڈھونڈتا ڈھانڈتا بجلی گھر کے قریب ان کے گھر جا پہنچا۔ آواز دی تو خود باہر تشریف لائے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو بہت خوش ہوئے، کمرے میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد آ کے بولے۔

''نہانے کا پانی تیار ہے، مگر نہانے سے پہلے مرغی ذبح کر دو تا کہ کھانا تیار ہو سکے۔''

میں نے گھر کے اندر صحن میں جا کر بسم اللہ پڑھ کر مرغی ذبح کی۔ اور غسل کرنے چلا گیا۔ نہا دھو کر جو بیٹھک میں آیا تو ڈاکٹر صاحب سے یہ گفتگو ہوئی۔

ڈاکٹر موہن سنگھ: بیٹا آرام سے نہا لئے؟ پانی ٹھیک گرم تھا؟

ابوالخیر: جی، شکریہ، ڈاکٹر صاحب آپ نے بڑی زحمت کی۔

ڈاکٹر موہن سنگھ: بیٹا لو یہ جانماز بچھاؤ، ادھر اس طرف قبلہ ہے، پہلے نماز پڑھ لو، پھر باتیں کریں گے۔

☆☆☆☆☆

آپ پلاسٹک کے اس ٹکڑے کو جانماز بنا لیجئے

روزنامہ جنگ میں اپنے کالم ''سچ کی صلیب'' (مورخہ 4 جولائی 1980ء) میں سید ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں۔

1970ء میں جاپان کی یوادسا کا یونیورسٹی میں اردو اور مطالعہ پاکستان کا استاد مقرر ہوا تھا۔ جب میں پہلے دن یونیورسٹی پہنچا تو شعبہ اردو کے پروفیسر کان گایا نے پہلے تو یونیورسٹی کی سیر کرائی۔ آخر میں انہوں نے وہ کمرہ مجھے دکھایا، جس میں مجھے بیٹھ کر تین سال کام کرنا تھا۔ میں نے دیکھا میز کے نیچے چپلوں کا ایک جوڑا ہے اور پلاسٹک کا ایک خاصا بڑا ٹکڑا میز کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ یہ دو چیزیں دیکھ کر مجھے کچھ حیرت سی ہوئی، یہ کس لئے ہیں، میری حیرت کو بھانپتے ہوئے پروفیسر کان گایا نے کہا:

پروفیسر گایا: کشفی صاحب، عام طور پر ظہر کی نماز کے وقت آپ یہیں ہوا کریں گے۔

ابوالخیر کشفی: جی۔

پروفیسر گایا: اس لئے چپلوں کا جوڑا اور پلاسٹک کا ٹکڑا حاضر ہے، اسے آپ جانماز بنا لیجئے۔

ابوالخیر کشفی: بے حد شکریہ، پروفیسر صاحب۔

پروفیسر گایا: شکریے کی ایسی کوئی خاص بات نہیں، آپ کی میزبانی میرے فرائض میں شامل ہے۔ ویسے نماز کا لحاظ ہم نے جمعہ کو بھی رکھا ہے۔

ابوالخیر کشفی: کیسے؟

پروفیسر گایا: ہم نے جمعہ کے دن آپ کا کوئی پیریڈ نہیں رکھا۔

ابوالخیر کشفی: پروفیسر صاحب، میں اس خصوصی توجہ کیلیئے آپ کا ممنون ہوں لیکن یہ عرض کر دوں کہ جمعہ کی نماز کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی، بلکہ قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین پر اللہ کے فضل (رزق) کی تلاش میں بکھر جاؤ۔ یعنی مصروف کار ہو جاؤ۔

پروفیسر گایا: مجھے اسلام کی جامعیت اور آپ کے دین میں دین و دنیا کی یکجائی کا تھوڑا بہت علم ہے۔ مگر قصہ یہ ہے کہ مسجد ایک دوسرے شہر کے کونے میں ہے جو یہاں سے تیس چالیس کلو میٹر دور ہے۔ وہاں جمعہ کی نماز کیلیئے آنے جانے میں خاصا وقت درکار ہوگا اس لئے جمعہ کے دن ہم نے کوئی پریڈ نہیں رکھا۔ میں نے ایک طالب علم سے کہا وہ ایک آدھ روز میں آپ کے ساتھ جا کر کونے کی مسجد دکھا آئے گا۔

ابوالخیر کشفی: پھر تو آپ نے بڑا اکرم کیا، اس کیلیئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

لیکن بات یہاں تک ختم نہیں ہوئی، چند روز بعد، پروفیسر گایا سید ابوالخیر کشفی کے ہاں تشریف لائے، ان کے ہاتھ میں قرآن حکیم کا نسخہ تھا۔

پروفیسر گایا: انشاء اللہ کل سے جاپان میں رمضان المبارک شروع ہو رہا ہے، میں نے سوچا آپ کو رمضان کی مبارکباد دوں اور قرآن پاک کا یہ نسخہ پیش کروں۔

ابوالخیر کشفی: ہم پریشان تھے کہ آغاز رمضان کی اطلاع کیسے ہوگی، آپ نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ آپ کے خصوصی التفات کیلیئے ہم آپ کے انتہائی شکر گزار ہیں۔ قرآن حکیم کا بھی بے حد شکریہ، لیکن قرآن حکیم کا ایک نسخہ ہم پاکستان سے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔

پروفیسر گایا: وہ تو ٹھیک ہے لیکن رمضان تو عبادتوں کا مہینہ ہے، رمضان کی راتوں میں آپ کو اور شاید بیگم صاحب کو قرآن کریم کے دو نسخوں کی ضرورت ہو۔

☆☆☆☆☆

پانی کی سبیل کا ثواب اور عذاب

روزنامہ جنگ کے مشہور کالم نگار انعام درانی صاحب سے ایک انٹرویو!

آپ نے 8 اگست 1980ء کے کالم کے آخر میں لکھا ہے۔

''کوئی خدارا بتائے کہ یہ سب کیا ہے؟''

کار خیر بھی اگر کرب و عذاب کا موجب بن جائے تو کیسے فلاح کی راہیں نکالو گے۔ یہ کیفیت تو مسدس حالی میں زمانہ جاہلیت کی عکاسی میں بھی نہیں پائی جاتی۔ وہاں بھی صرف یہ ہے۔

''کہیں پانی پینے پلانے پر جھگڑا''

وہ عکاسی اتنی دردناک نہیں جتنی یہ حقیقت ہے۔

سوال: درانی صاحب، وہ کون سا کار خیر تھا جو آپ کیلئے موجب کرب و عذاب بن گیا۔ اور جس کے حوالے سے آپ نے معاشرہ کے بعض حد درجہ تشویش ناک رجحانات کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت سمجھی؟

جواب: ساری بات پانی پلانے سے شروع ہوئی۔

سوال: وہ کیسے؟

جواب: ہمارے گھر کے پاس ایک پرائمری سکول ہے جس کی چھٹی ٹھیک دوپہر کے وقت ہوتی تھی، بچے اور بچیاں گھر کے سامنے واقع بس سٹاپ پر کھڑے بس کے انتظار میں پیاس سے تڑپا کرتے تھے۔ یہ صورت حال بہت دنوں سے تھی۔ ایک ہوشیار بچے نے ہمت کر کے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ اور پینے کیلئے پانی مانگا۔ ہم نے

ٹھنڈے پانی کا گلاس دے دیا۔ وہ پانی پی کے گیا تو ایک ننھی منھی بچی آئی، اس نے بھی گھنٹی بجائی اور کہا، آنٹی پانی، میری بیوی نے اسے بھی پانی پلا دیا۔ اور بات آئی گئی ہوگئی دوسرے روز پانچ بچے آئے اور تیسرے روز پندرہ بیس، چوتھے روز اس سے بھی زیادہ۔ اتنے بہت سے بچوں کو ہم کہاں تک پانی پلاتے۔ لیکن بچوں کو پیاسا بھی نہیں دیکھا جاتا تھا۔

سوال: پھر آپ نے کیا کیا؟

جواب: ہم نے تین کولر خرید کر برآمدے میں گلاسوں سمیت رکھوا دیئے۔ ڈھائی روپیہ کی برف پڑتی تھی۔ بچے گرمی میں آ آ کر پانی پیتے اور مجھے خوشی ہوتی تھی۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک چلتا رہا۔ اس کے بعد اس کارخیر میں کچھ مشکلات پیش آنے لگیں۔

سوال: مثلاً کیا؟

جواب: پہلے تو یہ کہ بچوں کے ساتھ بڑے بھی گھر میں گھسنے لگے اور آئے دن گلاس بھی چوری ہونے لگے۔ شام کو جوں ہی گھر میں قدم رکھتا پانی سے متعلق دو چار مسئلے میرا انتظار کر رہے ہوتے۔

سوال: پھر آپ نے کیا کیا؟

جواب: بچوں کو بڑوں سے الگ رکھنے کیلئے اور گھر کو محفوظ رکھنے کیلئے مجھ فقیر نے ایک ٹینکی گھر سے باہر بنوا دی اور زنجیر سے باندھ کے گلاس بھی لٹکوا دیئے۔ اس عرصے میں برف مہنگی ہوتے ہوتے اور اس کی مقدار بڑھتے بڑھتے روزانہ کا خرچ ساڑھے بارہ روپے تک پہنچ گیا، ہر چند کہ اس کار خیر پر ہر روز اتنا صرف کرنا میری استطاعت سے باہر تھا، میں نے اس سلسلے کو منقطع نہیں کیا اور ٹینکی میں برف ڈلواتا رہا، اب ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

سوال: یعنی؟

جواب: یعنی یہ کہ بعض بھلے مانس ٹھنڈے پانی کے کنستر بھر بھر کر وہاں سے لے جانے لگے، اس طرح وقت پر بچوں کو پانی نہ ملتا۔ اس ناجائز استعمال کو روکنے کیلئے گھر کے سامنے ٹیکسی ڈرائیوروں کی خدمات حاصل کیں۔ طے یہ ہوا کہ بیشک چھوٹا بڑا سبیل سے پانی پیئے۔ لیکن پانی کے کنستر بھر کے نہ لے جائے۔ اس پر بعض لوگ باز نہ آئے تو بعض ڈرائیوروں نے مزاحمت کی۔ اس طرح کنستروں والا سلسلہ تو بند ہو گیا لیکن دوسرا انتقامی سلسلہ شروع ہو گیا۔

سوال: وہ کیا؟

جواب: وہ یہ کہ جن لوگوں کو کنستروں سے پانی لے جانے سے منع کیا تھا وہ موقع پا کر سبیل کی ٹونٹی غائب کر دیتے اور سارا پانی بہہ جاتا۔

سوال: آپ نے ان لوگوں کو پکڑوایا نہیں؟

جواب: پکڑوانا کیا تھا، پکڑوانے میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ بہر حال میں نے سوچا کہ ان کو صبر وضبط کی مار دینی چاہیے۔ میں نے خاموشی سے ٹونٹیاں دوبارہ لگوانی شروع کر دیں۔ تو وہ بھلے آدمی دوسرے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔

سوال: اب کیا کیا؟

جواب: ٹینکی میں مٹی یا پتھر ڈال دیتے جس کی وجہ سے نہ صرف ٹھنڈا پانی ضائع ہو جاتا بلکہ ٹینکی کی صفائی بھی کروانا پڑتی۔ اس میں وقت اور پیسہ دونوں لگتے غرض اس سبیل کی دیکھ بھال کیلئے جو قدم بھی اٹھایا جاتا بعض نامعلوم دوستوں کو ناگوار گزرتا وہ انتقامی کارروائی بھی کرتے جس میں گالیاں لکھنا بھی شامل ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ اس سبیل کی وجہ سے بعض اچھے بھلے اہل محلّہ بھی ناراض ہو گئے۔

سوال: وہ کیسے؟

جواب: رمضان کے مہینے میں برف ڈلوانا اس لئے بند کر دیا کہ دن میں راہ چلتے لوگ پانی

پیتے رہتے تھے اور اس طرح احترام رمضان کی نفی ہوتی تھی۔ اب روزے داروں کو یہ شکایت ہوئی کہ افطار کے وقت اور اس کے بعد ٹھنڈا پانی نہیں ملتا۔ چنانچہ یہ انتظام کرنا پڑا کہ مغرب سے پہلے پانی فراہم کیا جائے اور سحری کے فوراً بعد باقی پانی بہا دیا جائے۔ ایک دن اس عمل میں کوتاہی ہوئی تو پھر کسی نے دن کے وقت سبیل سے پانی لیا۔ یہ دیکھ کر کسی کی دینی حمیت کو جوش آیا اور پھر ٹونٹی غائب۔

یہ صورت حال ہے، لوگ کہتے ہیں اور لگواؤ سبیل اور ثواب لو کار خیر کا۔ جب سے سبیل کا سلسلہ شروع ہوا ہے گھر والوں کا صبر وسکون غارت ہو گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قوم اس قابل ہی نہیں رہی کہ اس کی فلاح کیلئے کچھ سوچا جائے، کچھ کیا جائے۔

سوال: پھر اس صورت میں کیا کیا جائے؟

جواب: ہر کار خیر کو ایک جہاد سمجھ کر کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے شاید مادی تکلیف ہو تو ہو پر اخلاقی نقصان ہر گز نہ ہوگا، پھر خدا کا وعدہ ہے۔

لیس للانسان الا ماسعیٰ

(ہر انسان کو اس کی سعی کا صلہ ضرور ملے گا)

دوسرا یہ کہ زندگی میں ہماری ذمہ داری صرف کام کی ہے نتیجہ کی نہیں، ہمارا کام صحیح سمت میں کوشش کرنا اور کرتے رہنا ہے، نتائج ہماری ذمہ داری نہیں۔ تیسرے یہ کہ معاشرہ کے اس طرح کے منفی رجحانات کا تجزیہ بھی کرنا چاہیے، اور ان کی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو ان منفی رجحانات کی پرورش کر رہے ہیں، بلکہ جنہوں نے ان رویوں کو جنم دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

تصانیف وتالیفات

1. Learning to Lead
2. In Search of Maturity
3. From School to College
4. A Lasting Light House
5. In Search of Character
6. Beacon Light
7. Light a Candle

8. حیاتِ قائداعظمؒ
9. تذکرۂ اقبالؒ
10. مکالمات اقبالؒ
11. گفتاروکردارقائداعظمؒ
12. کردار کی کرنیں
13. کردارساز
14. شادبادمنزل مراد
15. پاکستانیت اور کیریکٹر بلڈنگ
16. کیریکٹر بلڈنگ اور پبلک سپیکنگ
17. تذکرہ شہداء
18. جرأتوں کے نشاں
19. میجر اکرم شہید نشان حیدر
20. کرنل حق نواز شہید ستارہ جرأت
21. شہید سیاچن
22. چراغوں کی قطار
23. داستانِ علم وعمل (جلد اول، دوم، سوم)
24. آدمی میں انسان کی تلاش
25. دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو
26. روشن راہیں
27. دانائی کی تلاش (جلد اول، دوم)
28. گفتاروکردارسرسیدؒ

آدمی اور انسان

فرق ہے
آدمی اور
انسان میں
آدمی پیدا ہوتا ہے
اور
انسان بنتا ہے
اپنی جدوجہد سے
اپنی کوشش سے
انسان کی پہچان ہے
اخلاقی جرات
Moral Courage
ہر موقع پر
ہر صورت میں
انسان کے
دل میں
خودغرضی کا

زہر نہیں ہوتا
انسان
حسد کی آگ
میں
نہیں جلتا
انصاف کرتا ہے
ہر ایک سے
ہر قیمت پر
انسان
انسان دوست
ہوتا ہے
"خدا دوست،
انسان دوست"
انسان
اپنے پرائے کا
غم کھاتا ہے

انسان مصیبت میں
غیروں کے
کام آتا ہے
انسان
گرتوں کو
تھام لیتا ہے
انسان
ہوتا ہے
صادق اور امین
باعث
خیر کثیر
"فرشتہ سے بہتر ہے
انسان بننا
مگر اس میں
لگتی ہے
محنت زیادہ"

(سعید راشد)